جموں و کشمیر کی خواتین افسانہ نگار
(حصہ اول)
سہیل سالم

جموں و کشمیر کی خواتین افسانہ نگار

حصہ اول

سہیل سالمؔ

میزان پبلشرز

ISBN-973-93-30691-33-8

نام کتاب:۔ جموں وکشمیر کی خواتین افسانہ نگار

نوعیت:۔ فکشن

مرتب:۔ سہیل سالم

قیمت:۔ تین سو پچاس روپیہ

تعداد:۔ ۵۰۰

سال:۔ ۲۰۱۹

کمپوزنگ:۔ نذہت خان

مطبع:۔ میزان سروسز

ناشر:۔ میزان پبلشرز۔سرینگر۔زیر اہتمام

Publisher:- **Meezan Publishers**
Opp. Fire & Emergency Services
HQRS, Batamaloo. Srinagar
Kashmir, 190009
Tel :: Fax: 2457215،7006773403
Cell: 9419002212, 494002212

انتساب

اپنی والدہ محترمہ کے نام جن کی دعاؤں کے سائبان نے
مجھے کڑی دھوپ میں بھی محفوظ رکھا

☆☆☆

استادوں کے استاد، ریاست کے کہنہ مشق صحافی، ادیب اور قلم کار

نیز

کشمیر اعظمی کے ایگزیکٹو ایڈیٹر
استاد محترم جناب جاوید آذر کے نام

☆☆☆

اشرف عادل اور ڈاکٹر کوثر رسول کے نام جنہوں نے
مجھے ادب کے ساتھ ساتھ انسانیت کا سبق بھی پڑھایا

مشمولات

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

عورت ہر عہد میں موضوع بحث رہی ہے۔اس امتیاز کے بغیر کہ کبھی اس کی وفا،تو کبھی اس کی بے وفائی،کبھی اس کی ممتا تو کبھی درندگی،کبھی اس کی محبت تو کبھی نفرت،کبھی اس کی حیا تو کبھی بے حیائی اور کبھی اور کچھ،اس کے موضوع بحث بننے کا سبب رہا۔وہ مرد اساس سماج میں گھٹن بھری زندگی جینے پر مجبور ہوئی یا اسی معاشرے میں اسے کچھ اختیارات ملے،دونوں صورتوں میں اس کا ذکر ہوتا رہا۔ادب،جو سماج کا آئینہ بھی ہوتا ہے،عورت کی ان تمام تصویروں کو اپنے صفحات میں وقفے وقفے سے رقم کرتا رہا۔ادب کی تمام اصناف بلا امتیاز شعرونثر عورت کے تمام روپوں کو اپنی غذا کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔اس کا حسن،اس کی حالت راز اور اس کے ناز وانداز کو طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا گیا۔اردو افسانے نے ابتدا سے ہی عورتوں اور اس کے مسائل پر توجہ دی۔پریم چند سے لے کر اب تک اردو افسانے کا ایک کثیر حصہ خواتین سے کسی نہ کسی طور وابستہ ہے۔بیشتر افسانہ نگاروں نے چاہے وہ مرد ہوں یا عورت،خواتین کو موضوع بنا کر اپنی تخلیقی قوتوں کو جلا بخشی ہے۔

ہر دور کا ادب اپنے سماجی،معاشی اور سیاسی نظام وصورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔یہ خاصیت ریاست کی معاصر خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔انھوں نے آج کے مسائل کو اپنی کہانیوں کے لیے موضوع کا انتخاب کیا ہے اور زیادہ تر

خواتین نے روایتی عشق ومحبت کی داستانیں نیز سراسر تجریدی اور علامتی حکایتیں بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔انہوں نے بیانیہ انداز اختیار کر کے اپنی کہانیوں میں زندگی کے مختلف رنگوں کو فطری انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر ترنم ریاضؔ، نعمیہ احمد مہجورؔ، سیدہ نسرین نقاشؔ، رنفر کھوکرؔ، ڈاکٹر نکہت نظرؔ، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحویؔ، ڈاکٹر ممتاز کوثر، واجدہ تبسمؔ، تبسم ضیا، میت کور، شبنم بنت رشیدؔ اور رافعیہ والیؔ وغیرہ ریاست کی وہ معاصر خواتین افسانہ نگار ہیں جن کی تخلیقات موضوعاتی اور ادبی سطح پر بحث کا موضوع بنی ہیں۔ان افسانہ نگاروں کے یہاں فنی اور موضوعاتی دونوں سطح پر نئی پرانی روایتوں کا حسین امتزاج اور کہانیوں کا نیا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ریاست جموں وکشمیر کی جو خواتین افسانہ نگار آسمان ادب پر طلوع ہوئیں ان کے افسانوں کو مرتب کرنے کی ایک حقیر سی کوشش کی ہے۔

میں اس کتاب کو قارئین کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے میں خاصی مسرت کر رہا ہوں۔یہ کتاب شاید پہلے شائع ہوئی ہوتی ،لیکن مواد کی وجہ سے یہ کام تعطل کا شکار رہوا۔بہر حال دیر آید درست آید۔آج یہ کتاب طباعت کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر آئی یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔میں ان تمام خواتین قلمکاروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی تخلیقات اس کتاب کی زینت بنیں۔میں بالخصوص جموں اینڈ کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ، کشمیر اعظمی کے ایگزیکٹیو ایڈیٹر استاد محترم جناب جاوید آذر اور ریاست کے معتبر فکشن نگار جناب نور شاہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے لئے مجھے کافی مواد فراہم کیا۔اپنے رفیق وشفیق اساتذہ صاحبان پروفیسر نذیر احمد ملک، پروفیسر منصور احمد منصور، جناب سلیم سالک، جناب اشرف عادل، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر الطاف انجم اور ڈاکٹر شاہ فیصل کا سپاس گراز ہوں کہ جنھوں نے وقتاً فوقتاً کتاب کی ترتیب کے حوالے سے کئی مفید مشورے دیئے۔اپنے دوستوں میں قیصر الحق، زبیر قریشی، شہنواز ساموں اور عارض ارشاد کا

بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ہر وقت حوصلہ افزائی سے نوازا۔
میں میزان پبلشرز کے مالک جناب شبیر احمد ماٹجی صاحب کا ممنوں ہوں جو میرے اس مسودے کو چھاپنے کے منتظر تھے، مجھے یقین ہے کہ ارباب علم وادب اور دانش وبنیش میری اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

سہیل سالم
رعناواری سرینگر

salimsuhail3@gmail.com

نور شاہ

جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی روایت

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان کو پہلی بار اپنی شناخت اور پہچان اب سے قریب قریب ایک سوتیس برس قبل مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دورِ اقتدار میں ملی تب سے اُردو زبان کی ریاست جموں وکشمیر سے ایک اَن مٹ وابستگی رہی ہے اور آج اُردو ریاستی آئین کے پس منظر میں یہاں کی قومی اور سرکاری زبان ہے اور نہ صرف ریاست میں بودوباش رکھنے والے مختلف ذاتوں، نسلوں، قبیلوں اور لسانی گروہوں کے درمیان ایک رابطے کا کارنامہ انجام دے رہی ہے بلکہ یہ رنگارنگی، ثقافتی اور تہذیبی شناختوں، تمدنی اثاثوں، مذہبی عقیدوں اور مجموعی طور پر برصغیر کے رہنے والوں کے جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں مختلف زبانیں بولنے والے شعرا اور اُدبا نے خونِ جگر پلا کر اس کی آبیاری کی ہے۔ بے پناہ عوامی مقبولیت' جاذبیت، وسعت اور عقیدت کے پیش نظر اُردو ریاست اور ریاست سے باہر باہمی بھائی چارہ کو یقینی بنانے کے لیے روزِ اول سے ہی ایک اہم کارنامہ انجام دے رہی ہے۔ اُردو زبان اب تعلیمی اور تاریخی اسباب کی بنا پر ریاست کی عوامی زبان کا روپ اختیار کر چکی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں شاعری کے بعد جس صنفِ ادب کو فروغ حاصل ہوا وہ افسانہ نگاری ہے' آج کے بکھرے ہوئے انسان کے لمحاتی تجربوں کے اظہار کے لیے افسانہ ایک موثر وسیلہ ہے' افسانہ تجربہ ہے' مشاہدہ ہے' احساس اور بصیرت ہے' افسانہ ایک تحریک بھی ہے۔ افسانہ صدیوں سے دُنیا کی مختلف زبانوں میں اپنے انداز اور اپنے اسلوب سے لکھا جا رہا ہے اور اُس وقت تک لکھا جائے گا جب تک ہمارے تخلیقی عمل میں سماجی' معاشی' تاریخی شعور اور تہذیبی وابستگی کی بات ہوگی۔ بستیوں اور شہروں میں جینے کے انداز بدلتے رہتے ہیں' انسانی ترجیحات اور سماجی قدریں بدلتی رہتی ہیں' نئے پرانے تقاضے بدلتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ افسانوی اسلوب میں بھی نیا نظریہ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ افسانہ نیا رنگ وروپ اختیار کرتا جا رہا ہے' بدلتے حالات میں ریاست سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی بدلاؤ آچکا ہے' یہاں کی افسانہ نگاری کا آغاز اگرچہ روایتی انداز سے ہوا لیکن رفتہ رفتہ

لکھنے والوں کے شعور میں بیداری پیدا ہوئی اور فن افسانہ نگاری پر اُن کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ صلاحیتیں اُبھرنے لگیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی، معاشی، اقتصادی، سیاسی اور نفسیاتی باریکیوں کی عکاسی کرنا شروع کردی اور حالات و واقعات کو مقامی رنگ دیا، مقامی کرداروں کو پیدا کیا، ریاست جموں وکشمیر کی سماجی اور معاشی صورت حال کا احاطہ اپنے انداز سے کیا۔

ہمارے بہت سارے افسانہ نگار اب باحیات نہیں، کچھ ایسے افسانہ نگار بھی ہیں جنھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اُردو سے کیا لیکن بعد میں وہ مادری زبان کی جانب راغب ہوگئے، بعض افسانہ نگار بیرون ریاست چلے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی نئے کہانی کار سامنے آگئے، نئے جوش اور ولولے کے ساتھ، نئی قوت اور تازگی کے ساتھ اور اس طرح جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کا سفر جاری رہا۔

آج جب ہم ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی بات کرتے ہیں تو پریم ناتھ پردیسی کا نام سامنے آتا ہے شاید اس لیے کہ ریاست میں اُردو افسانے کی باقاعدہ ابتدا پردیسی سے ہی ہوئی اگرچہ اُن سے پہلے بھی کئی افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔ لیکن پردیسی کے افسانوں کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد بھی اُن کے افسانے معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی کہانی ٹیکہ بٹنی ماہنامہ ہمایوں لاہور میں 1946 میں شائع ہوئی جو اپنے دور کی ایک عظیم کہانی تھی۔ ان کی ایک اور کہانی کیچڑ بھی 1946 میں ماہنامہ ساقی میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کے تینوں کردار جموں کی ایک فیکٹری میں کام کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں، پردیسی کے تین افسانوی مجموعے شام وسحر، دنیا ہماری اور بہتے چراغ شائع ہوچکے ہیں۔ برج پریمی کی کتاب ''پریم ناتھ پردیسی۔ عہد شخص اور فنکار'' کے عنوان سے حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ اُن کے اکثر افسانوں میں کشمیر کا ماحول نظر آتا ہے، وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ تپتے جہنم کی تصویر کشی، بھوک اور افلاس کا احساس دلاتے ہیں وہ کہتے تھے کہ کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ بجائے خود ایک افسانہ ہے، جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ اُن کے افسانے ''ڈھول'' سے ایک اقتباس.....!!

> ''اس نے کئی بار پس انداز کرنے کا مصمم اِرادہ کیا اور جوں ہی تھیلی میں تین روپے سے زیادہ اکیناں اور دونیاں جمع ہوتیں، یک لخت اس کا خاوند بستر پر دارز ہوجاتا دوا کے لیے تھیلی بھی خالی ہوجاتی اور پھر میر بحری کے مشہور سود خوار پنڈت سے بھی آٹھ دس روپیے قرض پر لیے جاتے...... ''!!!

قدرت اللہ شہاب کا تعلق بھی ریاست جموں وکشمیر سے ہے حالانکہ تقسیم ملک کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں جابسے اور ابدی نیند کے لیے وہاں کی مٹی کو ہی اپنا لیا۔ اپنی ابتدائی تعلیم ریاست میں حاصل کی۔ تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان میں کئی اہم عہدوں پر تعینات رہے اور پھر پاکستان جاکر بھی

کئی اہم عہدوں پر تعینات رہے اور اپنی قابلیت اور شخصیت کا لوہا منوایا۔ وہ اگر چہ آج بھی شہاب نامہ کی بدولت یاد کیے جاتے ہیں لیکن انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ 'چندروتی' تھا یہ افسانہ اختر شیرانی نے اپنے میگزین 'رومان' میں 1938 میں شائع کیا۔ 'ماجی' 'پہلی تنخواہ' جسونت سنگھ 'شلوار اور ایک ڈسپیچ' ان کے معروف افسانے ہیں یا خدا نامی افسانہ ان کی ایک غیر معمولی تحریر ہے۔ اس افسانے کا پس منظر 1947 کے فسادات ہیں۔ اُن کی تحریر کردہ کہانیوں کی تعداد قریب قریب چالیس ہے۔ اپنی کہانی ''چندروتی'' جو در اصل اُن کی اپنی محبت کی کہانی ہے، کو یوں شروع کرتے ہیں....!!

''جب مجھے چندروتی سے محبت ہوئی تو اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا''

نرسنگھ دیو نرگس اپنے دور کے اہم قلم کاروں میں ایک مقام رکھتے تھے' ان کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔

راما نند ساگر اپنے دور کے ایک معروف کہانی کار رہے ہیں انھوں نے کشمیر کے پس منظر میں بہت سی کہانیاں قلم بند کی ہیں۔ 'ٹنگمرگ کے اڈے پر' اور 'کشمیر کی بیٹی' ان کے دو مقبول افسانے ہیں، چونکہ وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے اس لیے افسانوی دنیا سے دور ہوتے گئے۔ 'اور انسان مر گیا' ان کا ایک اہم ناول مانا جاتا ہے۔

اس دور میں پریم ناتھ در کا نام بھی سامنے آتا ہے ان کے افسانوں میں غم آلودہ اور درد بھرے ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ 'گیت کے چار بول' نامی کہانی میں انھوں نے مچھلی فروخت کرنے والوں کی زندگی' ان کی معاشی اور اقتصادی حالت کو پیش کر کے زندگی کے ایک تاریک رُخ سے پردہ اٹھایا ہے۔ در صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کاغذ کا واسدیو' 1948 میں شائع ہوا' اس کے بعد ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'نیلی آنکھیں' 1961 میں شائع ہوا۔ ان کا افسانہ 'آخ تھو' آج بھی اہم افسانوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان کا افسانہ 'غلط فہمی' لاہور سے شائع ہونے والے معروف جریدہ ادبی دنیا میں 1945 میں شائع ہوا تھا در صاحب کے افسانوں کا انتخاب جی آر حسرت گڈھا نے 'چناروں کے سائے میں' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جب در صاحب کی پہلی کہانی 'غلط فہمی' لاہور سے شائع ہونے والے معروف جریدہ 'ادبی دنیا' میں 1945 میں شائع ہوئی تو ادبی دنیا کے مدیر صلاح الدین پرویز نے اس کہانی کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ پریم ناتھ در بہت جلد افسانوی حدود کو آگے بڑھائے گا اور فن کے جھنڈے ان دیکھے میدانوں میں گاڑے گا۔ پریم ناتھ در نے یہ بات ثابت کر کے دکھائی۔ ریاست کے ایک نامور صحافی اور قلم کار مرحوم شمیم احمد شمیم نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پریم ناتھ در کے موضوع سے قطع نظر ان کی زبان کے برتاؤ پر بڑا رشک آتا ہے۔ یہ شخص اردو زبان کو اتنی مشاقی اور چابکدستی سے استعمال کرتا ہے کہ خود اہل زبان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اپنی کہانی 'کاغذ کا واسدیو' کا اختتام یوں کرتے ہیں... ''نہیں نہیں کا کا' یہ کھیل ٹھیک نہیں تم ابا مت بنو کا کا' مجھے ڈر لگتا ہے کا کا... مت بنو کا کا....''!!

اس دور کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے، پہلے میں ان افسانہ نگاروں کا نام لینا چاہوں گا جواب حیات نہیں۔ ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، برج پریمی، برج کیتال، مالک رام آنند، لیش سروج، رام کمار ابرول، وجے سوری، کلدیپ رعنا، غلام رسول سنتوش، انیس ہمدانی، محی الدین شاہ، ظفر احمد، م م صدیق، بشیر شاہ اور شمس الدین شمیم کے نام مجھے یاد آرہے ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کی کہانیوں میں پہاڑی رومان 'گلاب کے پھول' کی طرح شاداب نظر آتا ہے ان کے ناولوں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن ان کے صرف تین افسانوی مجموعے 'زندگی کی دوڑ'، چٹانوں کے چاند' اور یادوں کے کھنڈر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی پہلی کہانی کا نام تھا 'کالکی'۔ یہ کہانی جموں سے شائع ہونے والے اخبار چاند میں شائع ہوئی تھی۔ موت کے سائے نامی افسانہ پر انھیں کل ہند افسانوی مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا۔ ٹھاکر پونچھی 1922 میں پیدا ہوئے اور 1973 میں ایک سڑک حادثے میں جان بحق ہوگئے۔ 'بے خواب کواڑ' ان کا ایک مشہور افسانہ ہے۔ اس افسانے سے ایک مختصر اقتباس.... "!!

"ایک دوسرے کے چہروں پر انھیں صرف فائلوں کے انبار اور ٹائپ مشین کے بے ترتیب حروف کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ جوانی کے تجسس بھرے چہرے پر جو محبت کی غیر مرئی ریکھائیں ہوتی ہیں، چاندنی راتوں کی سرگوشیاں ہوتی ہیں وہ کہیں نہ تھیں، اُن کی جگہ ایک عجیب سے کرب اور انوکھی سی تڑپ کی دراڑیں تھیں جیسے ایک بھوکی دھرتی ہو ایک بھوکا کسان ہو اور آسمان ننگا ہو کوئی بارش، کوئی بوند، کوئی آس، کوئی اُمید نہ ہو.....!!"

موہن یاور کے تین افسانوی مجموعے وہسکی کی بوتل (1958) تیسری آنکھ (1960) اور سیاہ تاج محل (1961) شائع ہوچکے ہیں۔ 1962 میں انھوں نے ایک افسانوی انتخاب 'توی اور جہلم' کے عنوان سے ترتیب دیا۔ اپنے زمانے میں موہن یاور اپنے انداز نگارش کی شگفتگی اور سماجی شعور کی وجہ سے اردو کے جدید ترین افسانہ نگاروں میں کافی اہمیت رکھتے تھے....

"ٹھاکر بہادر سنگھ اب صرف نام کے جاگیر دار رہ گئے تھے، مگر ٹھاٹھ باٹ وہی باپ دادا والے تھے اگر کچھ فرق تھا تو یہی کہ وہ حویلی اداس تھی جہاں رات رات بھر نغمہ و سرود کی محفل جمی رہتی تھی...!!" (یہ آنکھیں یہ راستے ...1959)

علی محمد لون (1926-1987) بنیادی طور پر ایک کامیاب ڈرامہ نگار تھے، انھوں نے ریڈیو اور سٹیج کے لیے ان گنت ڈرامے قلم بند کیے۔ وہ افسانے بھی لکھتے تھے لیکن ان کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ اُن کی تحریر کردہ کہانیاں آرزو کا سلسلہ لاانتہا، ماں، سکھ کا ساحل، پاپی پجاری کی سنتان، نالے کا بادشاہ، انسان اور چھینٹے، بت شکن، تم سب میرے ہو اور مونچھوں والی گڑیا اچھی کہانیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ دیکھیے اس کہانی سے یہ جملہ..... "اچھا یہ بتاؤ، جو نیا کھلونا آرہا ہے اس کی مونچھیں ہوں گی کہ نہیں....."

تیج بہادر بھان ایک پیدائشی قلم کار تھے' ان کا پہلا افسانہ لال چنری تھا جو 1951 میں شائع ہوا۔ وانگپن ان کا ایک شاہکار افسانہ تھا جو خواجہ احمد عباس کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ 'سرگرم' میں شائع ہوا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے جہلم کے سینے پر (1960) اور عورت (1962) میں شائع ہوے۔ان کی کہانیاں تلاش' جوتے' سہارا' عورت' میری اپنی بچی' اندازہ اور سنتوش مخصوص اندازِ تحریر کی بدولت مقبول ہوئیں۔ان کہانیوں میں عام لوگوں کے مسائل کی ترجمانی کی گئی ہے۔

پشکر ناتھ (1932-2005) کی پہلی کہانی... 'اور کہانی ادھوری رہ گئی' 1953 میں ماہنامہ بیسویں صدی میں شائع ہوئی۔ پھر پشکر ناتھ نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اندھیرے اجالے' ڈل کے باسی' عشق کا چاند اندھیرا اور کانچ کی دنیا۔ پشکر ناتھ کی تحریر کردہ اولین کہانیوں میں کشمیر کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے' کشمیر کی روح بولتی نظر آتی ہے' انھوں نے اپنی کہانیوں میں جدید ٹکنیک اور اسلوب کا استعمال کیا' ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی افسانوی زندگی کا آغاز 1950 میں آغا نامی کہانی لکھ کر کیا۔ ان کی تحریر کردہ کہانیوں میں سپنوں کی شام' لمحوں کی راکھ' خوابوں کے دریچے اور میرے بچے کی سالگرہ آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ برج کتیال نے فلمی دنیا کو اپنانے سے پہلے اُردو ادب کو کئی اچھی کہانیاں دیں۔اُن میں موت کے راہی' آنند' مایا پنجابن' آئینہ اور نرگس کے پھول شامل کی جا سکتی ہیں۔

عمر مجید کے افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اپنی وفات سے پہلے کشمیر کے پس منظر میں انھوں نے جو کہانیاں قلم بند کیں وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔اجالوں کا گھاؤ (1967) ان کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا۔عمر مجید کے منتخب افسانوں کا مجموعہ 2009 میں شائع ہوا یہ مجموعہ سلیم سالک نے ترتیب دیا ہے۔عمر مجید کا پہلا افسانہ 'ولر کے کنارے' 1965 میں شائع ہوا۔اُن کے افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انھیں کشمیر کی تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی وہ اپنی کہانیوں میں پاکیزہ روح کے متلاشی نظر آتے ہیں کشمیر کے موجودہ 'پرآشوب دور کے پس منظر میں انھوں نے کئی افسانے لکھے۔ان میں 'گمشدہ محبت' شہر کا اغوا اور میری گلی کا غم قابل ذکر ہیں۔کلدیپ رعنا کے افسانوں کے پس منظر میں کشمیر کی زندگی کا فطری رنگ ہے' ادھورے خواب اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ان کے دوسرے افسانوی مجموعے کا نام ''تنہائیاں'' ہے۔ان کا ایک افسانہ 'ایک شال سُرخ رنگ کا' کافی مقبول ہوا۔لیش سروج کے افسانوی مجموعے کا نام پیاسی زمین ہے۔ مالک رام آنند نے 1957 سے لکھنا شروع کیا' ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں 'شہر کی خوشبو' اور 'تصویر کے پھول'.... رام کمار ابرول اگر چہ کہانیاں بھی لکھتے تھے لیکن فلم ان کی کمزوری تھی۔ وجے سوری کی کہانیوں کا مجموعہ 'آخری سودا' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔وہ بھی فلموں میں کام کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔غلام رسول سنتوش بنیادی طور پر مصور تھے لیکن وہ افسانے بھی لکھتے رہے' ان کی کہانیاں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی کی کہانی پڑھ رہے ہیں یا ان

کی بنائی ہوئی کوئی پینٹنگ دیکھ رہے ہیں۔ انیس ہمدانی کی تحریر کردہ کہانیوں میں 'آہٹ' نامی کہانی کو بے حد سراہا گیا۔ م م صدیق 'احساس کے گھاؤ' نامی افسانوی مجموعہ لکھنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ محی الدین شاہ اور ظفر احمد کا مشترکہ افسانوی مجموعہ 'پھول اور آویزے' کے نام سے شائع ہو چکا ہے مرحوم محی الدین شاہ کی پہلی کہانی ماہنامہ سنگم میں شائع ہوئی تھی اور کافی مقبول بھی ہوئی۔ ظفر احمد نے کئی انگریزی کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کیا۔ شمس الدین شمیم کے افسانوں میں آس پاس کی معاشرتی زندگی کے سنجیدہ مسائل کا بجا طور پر احساس و ادراک ہوتا ہے ان کا ایک ہی افسانوی مجموعہ 'ویرانے' شائع ہوا ہے۔

بشیر شاہ مختصر کہانیاں قلم بند کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں مختصر افسانے لکھنے کا فن خوب آتا تھا۔ ان کی ابتدائی کہانیاں ماہنامہ بانو دہلی اور ماہنامہ شاعر ممبئی میں شائع ہوئیں۔ اُن کا کہانیاں لکھنے کا اپنا ایک انداز تھا جو دوسروں سے الگ ہے۔ اُن کے افسانوں میں آخر تک کہانی کا طلسم قائم رہتا ہے۔ شب کے سمندر میں ان کا پہلا اور آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کی کہانی ''تم میرے پاس ہو'' سے ایک اقتباس....!!

''زندگی عجیب ہے اور رنگ زندگی کے ہزار کبھی یہ رنگ اتنے شوخ نظر آتے ہیں کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور کبھی اس قدر کالے سیاہ کہ آنکھوں میں کچھ سماتا ہی نہیں' وقت بند مٹھی کا پانی ہے جو انگلیوں کی پوروں سے سرکتا ہے اس پانی پر کب کوئی تحریر لکھی جائے گی کوئی نہیں جانتا.....!!''

چند ایک خواتین افسانہ نگار بھی ہیں جو اب حیات نہیں لیکن اپنے تحریر کردہ افسانوں کی وجہ سے آج بھی ریاست کے اردو افسانے میں زندہ ہیں ان میں منظورہ اختر بھی ہیں' ان ہی کی طرح نرگس ستارہ کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ منظورہ اختر کا ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق تھا' ان کی کہانیوں میں درد و کرب کی ان گنت پرچھائیاں ملتی ہیں پاکیزہ سہارا اور جیون ساتھی ان کے دو فکر انگیز افسانے ہیں۔ اسی انداز کی انھوں نے مشترکہ 'قبر' اور جس دن بازار بند تھے' جیسی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ریاست کی اولین خاتون افسانہ نگاروں میں ان کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نرگس ستارہ مقامی اخباروں اور جریدوں میں تواتر کے ساتھ لکھتی تھیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں چند معروف افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُردو افسانہ لکھ کر کیا لیکن بعد میں مادری زبان میں لکھنے لگے لیکن آج بھی اردو کے افسانہ نگاروں کے ہجوم میں ان کا نام روشن ہے' ان میں اختر محی الدین' سوم ناتھ زتشی' پروفیسر مدن موہن شرما' امیش کول' ہردے کول بھارتی' غلام نبی بابا' فاروق مسعودی اور دیپک کول کے نام قابل ذکر ہیں اور بھی چند قلم کار ہیں جنھوں نے ابتدائی دنوں میں اردو میں افسانے لکھے لیکن بعد میں اردو کے افسانوی منظر سے غائب ہو گئے۔ جو چند نام میرے ذہن میں محفوظ ہیں وہ ہیں گنشیام سیٹھی' بھجن ساگر' سوم ناتھ ڈوگرہ'

روپ دے کر کتابی صورت میں پیش کیا اس کتاب کا پیش لفظ مرحوم علی جواد زیدی نے لکھا ہے۔ پیارے ہتاش بھی کبھی کبھار اُردو زبان میں تحریر کردہ کہانیوں کو کشمیری زبان میں ترجمہ کرتے ہیں اس کے نتیجے میں ریاست میں اُردو افسانہ دوسری مقامی زبانوں میں لکھے گئے افسانوی ماحول کو شادابی فراہم کرتا ہے۔

ادیب کارواں کا حصہ ہوتا ہے لیکن وہ اس کارواں میں فرد کی حیثیت سے بھی شرکت کرتا ہے اور تخئیل کے گھوڑے پر سوار اس کارواں کو دیکھتا ہے' ریاست جموں وکشمیر کے ادیب بھی اس کارواں کا حصہ ہیں وہ کچھ دیکھتے ہیں' محسوس کرتے ہیں تحریر میں لاتے ہیں۔ حالات و واقعات کو افسانوی رنگ دیتے ہیں اور اس طرح سے آج بھی ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کا سفر جاری ہے' حسن ساہو کی کہانیوں میں مقامی رنگ ملتا ہے' منصور احمد منصور خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ظہورالدین نقاد ہیں اور ادب کے مختلف گوشوں پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں ان کے تحریر کردہ افسانوں میں علامت کا صحیح ادراک ملتا ہے' شبنم قیوم کے افسانوں میں زندگی کے مختلف نشیب وفراز ملتے ہیں۔ غلام نبی شاہد اپنی ذہنی پختگی کے سہارے کہانیوں کی زلفیں سنوارتے ہیں۔ جان محمد آزاد کے افسانوں میں صحت مند پہاڑی فضا ملتی ہے'۔ وریندر پٹواری ایک حساس اور سنجیدہ کہانی کار ہیں' خواجہ فاروق رینز و اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی افراتفری کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زاہد مختار کی کہانیوں میں زندگی کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں' آنند لہر کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو چھوٹے کینوس پر سمیٹ کر پوری وضاحت اور کھل کر پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف آثاری کے افسانوں کے موضوعات نت نئے ہوتے ہیں۔ مشتاق مہدی کی کہانیوں میں انسانی حقیقتوں کی خوبصورتی اور بدصورتی نظر آتی ہے۔ شام طالب اپنے افسانوں کے ذریعے درد وکرب کی لہروں میں مٹھاس بھرنا چاہتے ہیں۔ شیخ بشیر احمد اپنی کہانیاں کشمیر کے موجودہ دور کے سماجی' سیاسی اور اقتصادی مسائل کے پس منظر میں لکھتے ہیں۔

پروفیسر ظہورالدین کا افسانوی مجموعہ 'کینی ہلز' کے عنوان سے 1981 میں شائع ہوا' یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے' پہلے حصے میں ان کے تحریر کردہ روایتی انداز کے افسانے شامل ہیں اور دوسرے حصے میں علامتی انداز کے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ 'تلافی' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات وحالات کو ایک منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا۔ 'جلن' ان کی پہلی کہانی ان کے دو افسانوی مجموعے 'زوجیلا کے اس پار' اور 'دوراہا' منظر عام پر آچکے ہیں۔ وریندر پٹواری ریاست کے ایک حساس' سنجیدہ اور ہونہار قلم کار ہیں' وہ افسانے کی تمام نزاکتوں سے آشنا ہیں۔ وہ 1965 سے کہانیاں لکھ رہے ہیں' ان کی پہلی کہانی کا عنوان تھا' 'سسکیاں' یہ کہانی ماہنامہ 'صبح امید'

(ممبئی) میں شائع ہوئی تھی۔ وریندر پٹواری کی کہانیوں میں زندگی کے مختلف پہلو اپنے تمام تر جمال کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ فرشتے روتے ہیں (1991) دوسری کرن (1986) بے چین لمحوں کا سفر (1988) آواز سرگوشیوں کی (1994) ایک ادھوری کہانی (2002) افق (2003) دائرے (2010) لالہ رخ (2012)۔ خالد حسین اگر چہ اب پنجابی زبان میں لکھتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز اردو افسانے سے کیا وہ اپنی کہانیوں کو ذرا ہٹ کر ایک نئے انداز سے لکھتے ہیں۔ ان کے ایک افسانوی مجموعے کا نام ہے ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں اور دوسرے کا نام ہے اشتہاروں والی حویلی۔ راجہ نذر بونیاری کا پہلا افسانہ 'چاندی کی جھگی' 1964 میں ماہنامہ 'پرواز' میں شائع ہوا، راجہ صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا دوسرا آدمی جو 1971 میں شائع ہوا، ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں' 2008 میں شائع ہوا۔ نذر بونیاری کی کہانیوں میں کہانی پن بخوبی ہوتی ہے۔ مالک رام آنند کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'شہر کی خوشبو' اور 'تصویر کے پھول' ان کے افسانوں میں انسان دوستی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جان محمد آزاد ریاستی افسانہ نگاروں میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو علامتوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں اور ان علامتوں اور تشبیہات کے لیے کائنات میں موجود قدرت کے عطا کردہ ان گنت عطیات کا سہارا لیتے ہیں اور افسانوی کردار بنا کر زبان دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ آسمان سے آشیاں تک 2009 میں منظر عام پر آیا۔ عبدالرحمان مخلص اگر چہ انشائیہ لکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن وہ کبھی کبھار افسانے بھی تحریر میں لاتے ہیں، ان کی زبان معنی خیز اور اسلوب بہت ہی پر وقار ہوتا ہے۔ شبنم قیوم کو افسانے لکھنے کے علاوہ کشمیر کی سیاسی تاریخ سے بہت دلچسپی ہے ان کے دو افسانوی مجموعے بعنوان ایک زخم اور سہی اور نشانات شائع ہو چکے ہیں۔ وحشی سید ساحل کے دو افسانوی مجموعے سڑک واپس جارہی ہے اور کنوارے الفاظ کا جزیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو زبان وبیان پر اچھی قدرت حاصل ہے اور ان کے افسانوں میں گہرے مشاہدوں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ حسن ساہو کی پہلی کہانی دلاری کے نام سے ہفت وار چترا میں 1953 میں شائع ہوئی ان کے افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پھول کا ماتم (1978) بستی بستی صحرا صحرا (1981) اندھا کنواں (1996) اور گردش دوراں (2010)، حسن ساہو اپنے افسانوں میں معاشی زندگی کی عکاسی بڑی خوبی سے کرتے ہیں اور ان کی کہانیوں میں مقامی رنگ ملتا ہے۔ دیپک کنول اب تک قریب قریب دو سو افسانے لکھ چکے ہیں اور آج بھی تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں ان کے تین افسانوی مجموعے ہیں۔ ہم تیرے ہو گئے (2001) برف کی آگ (2009) اور پیپوش (2011)۔ ان کے افسانے پڑھ کر ان کی ذہنی اور فکری بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ مشتاق مہدی کا افسانوی مجموعہ 'آنگن میں وہ' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں اور انسانی رشتوں کی کڑواہٹ سے بھرپور سچائیوں کو اپنی کہانیوں میں جگہ دیتے ہیں۔ خواجہ

فاروق رینزو شاہ کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ڈوبتے کنارے' 1979 میں شائع ہوا۔ خواجہ رینزو شاہ اپنے افسانوں میں سوسائٹی میں مساوات اور برابری کی بات کرتے ہیں۔ وجیہ احمد اندرابی صحافت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن افسانوی ادب میں بھی گہری دلچسپی لیتے ہیں اور کبھی کبھار افسانے بھی لکھتے ہیں۔ یہ افسانے کشمیر کے پس منظر میں ان کے ذاتی تجربات کی عکاسی کرتے ہیں۔

غلام نبی شاہد اپنی ذہنی پختگی کے سہارے اپنی کہانیوں کی زلفیں سنوارتے ہیں وہ افسانوی تکنیک سمجھتے ہیں اور برتتے بھی ہیں۔ ان کی کہانیاں بڑی صاف ستھری ہوتی ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1973 میں ہوا جب ان کی کہانی 'کتنے جھنڈے' روزنامہ آفتاب میں شائع ہوئی۔ کشمیر کے پس منظر میں انھوں نے جو کہانیاں قلم بند کی ہیں وہ کتابی صورت میں آچکی ہیں ان کے افسانوی مجموعے کا نام ہے 'اعلان جاری ہے'۔ ان کہانیوں میں ہمیں انسانی حقیقتوں کی بہت ساری خوبصورت اور بدصورت تصویریں نظر آتی ہیں۔ دیپک بدکی کی افسانوی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ ان کی تحریر کردہ کہانیوں کا دائرہ وسیع تر ہے ان کے افسانوں میں زندگی کے ترش و شیریں تجربے ملتے ہیں ان کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ادھورے چہرے (1998) چنار کے پنجے (2005) اور زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (2007)۔

زاہد مختار کا پہلا افسانہ 'چوٹ' کے عنواں سے روزنامہ زمیندار میں 1976 میں ان کے افسانوی مجموعے 'تیسرا کنارہ' اور تحریریں منظر عام پر آچکے ہیں' زاہد مختار کی کہانیوں میں زندگی کے ہزار ہا رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آنند لہر کے پہلے افسانے کا عنوان تھا 'پتھر کے آنسو' جو کالج میگزین میں شائع ہوا ریاست جموں و کشمیر سے جو افسانہ نگار باقاعدگی کے ساتھ اردو زبان میں افسانے لکھ رہے ہیں اور ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف جرائد میں چھپتے ہیں ان میں آنند لہر بھی شامل ہیں۔ انحراف اور سرحد کے اس پار ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ شام طالب افسانے لکھتے ہیں اور ریاست میں اور خاص طور سے جموں میں اردو ادب کو ترقی دینے کے لیے جو کام کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ پروفیسر نظام الدین شاہ کے دو افسانوی مجموعے پارس (2004) اور دوسرا مجموعہ 'ایک اور سجدہ (2009)' بھی شائع ہو چکے ہیں ان افسانوں میں اگرچہ جنسی معاملات کی عکاسی ہوتی ہے لیکن جمالیاتی وقار کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ طاہر حسین رند کے افسانے ہم عصر زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے کہکشاں اور سرابوں کا سفر شائع ہو چکے ہیں۔

شیخ بشیر احمد کا ادبی سفر 1968 میں شروع ہوا جب ان کی پہلی کہانی روزنامہ چنار سرینگر میں شائع ہوئی۔ عنوان تھا 'اور اس نے اپنی موت کا جواز تلاش کیا' ان کے افسانوں کا مجموعہ 'مٹھی سے بھاگا پرندہ' شائع ہو چکا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کی بنیاد سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اور حالات و واقعات کے حوالے سے رکھتے ہیں اور اِن کا تانا بانا تعمیر کرتے ہیں۔ رشید راہگیر (لداخی) کے افسانوں کا مجموعہ سویرا اندھیرا شائع ہو چکا ہے ان کی کہانیوں کی بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں مقامی رنگ ملتا ہے۔ مقامی

کردار ملتے ہیں اور وہ اپنے افسانوں کے ان گنت پہلوؤں کو مقامی رنگ سے سجاتے ہیں۔

ڈاکٹر منصور احمد منصور ریاست کے ایک با صلاحیت اور ہونہار افسانہ نگار ہیں۔ کشمیر خواب سراب گرداب، ان کی ایک اہم تصنیف ہے' یہ عذابوں کی بستی ان کی تحریر کردہ کہانیوں کا مجموعہ ہے ان کا پہلا افسانہ 'ممتا' 1976 میں شائع ہوا۔ 1999 میں آخری ایام میں جن افسانہ نگاروں نے جنم لیا اور اپنے افسانوں کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ان میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا نام بھی شامل ہے ان کے دو افسانوی مجموعے ہزاروں غم اور میٹھا زہر شائع ہو چکے ہیں' وانی صاحب زندگی کے چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل اپنے افسانوں میں ابھارتے ہیں۔ طالب کاشمیری کی کہانیوں پر مشتمل کتاب شناخت گل 2009 میں شائع ہوئی۔ وہ کہانی بُننے کے فن سے واقف ہیں۔ مجید ارجمند اپنے افسانوں میں مختلف سماجی اور اقتصادی مسائل کو اپنے انداز سے ابھارتے ہیں وہ اپنے آس پاس اور دور ونزدیک کے حالات و واقعات اور معاشرے میں ہو رہی تبدیلیوں سے واقف نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے کا نام ہے ابابیلوں کی واپسی جو 2009 میں اشاعت پذیر ہوا۔ کچھ لمحے کچھ سائے ڈاکٹر اشوک پٹواری کے افسانوی مجموعے کا نام ہے اردو کے طویل سفر میں ڈاکٹر اشوک پٹواری ایک الگ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

پرویز مانوس کے دو افسانوی مجموعے شکارے کی موت اور مٹھی بھر چھاؤں منظر عام پر آ چکے ہیں انھوں نے افسانہ نگاری کی شروعات 1985 سے کی اور ان کا پہلا افسانہ تھا احساس جو 1989 میں ہند سماچار میں شائع ہوا۔ پرویز مانوس اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کہانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں وہ طبقاتی کشمکش اور معاشرتی مسائل کی بھی عکاسی کرتے ہیں ان کے افسانوں میں کشمیر کے دھواں دھواں فضاؤں کے مناظر بھی ملتے ہیں۔ مشتاق کینی کی کہانیاں عوام دوستی اور انسان دوستی کی بڑی شفاف' رچی بسی اور تابناک تصویریں پیش کرتی ہیں' ان کا افسانوی مجموعہ شہر بے پرسان منظر عام پر آ چکا ہے۔ مقبول ساحل کے افسانوں میں تجربات کی خوشبو ملتی ہے، رومان سے بھر پور فضا میں بدصورتی کی عکاسی نظر آتی ہے ان کے لہجے اور زبان و بیان کا سفر زمانے کی رفتار کے ساتھ چلتا ہے اُن کے افسانوی مجموعے کا نام ہے ''قدم قدم ریزہ''

ڈاکٹر اشرف آثاری کا افسانوی مجموعہ 'افسانہ لکھ رہا ہوں' حال ہی میں شائع ہوا۔ ان کے افسانے منفرد لب و لہجے کی نشاندہی کرتے ہیں' ان کی تحریروں میں تازگی ہے اور شادابی بھی۔ ڈاکٹر آثاری کا پہلا افسانہ 1973 میں روزنامہ آفتاب میں شائع ہوا عنوان تھا 'زخمی مسیحا' ڈاکٹر آثاری اپنے افسانوں میں مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی غیر یقینی صورتحال کی نقاب کشائی کرتے ہیں وہ اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کو سمیٹتے ہیں اور ان سے دامن چھڑانے کے لیے راستہ بھی دکھاتے ہیں۔

''چنگاریاں' وزیر محمد میر کے افسانوی مجموعے کا نام ہے۔ ان کے افسانے کے کردار تصوراتی دنیا سے نہیں بلکہ زمینی اور حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ شفیع ایاز کی کہانیوں کے دو مجموعے، درد پنہاں اور

پگڈنڈی کا مسافر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں اپنے اردگرد کے ماحول کو دقیقہ شناسی سے تجزیہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کالے پیڑوں کا جنگل' شائع ہو چکا ہے، ان کی تحریر کردہ کہانیوں میں دردو کرب، خون خرابہ اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اس دور میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا جب کشمیر میں حالات انتہائی نازک دور سے گزر رہے تھے۔ میرا یوب میر کی پہلی کہانی جستجو تھی جو 1983 میں گلفام نامی فلمی میگزین میں شائع ہوئی۔ ٹھنڈی آگ (1993) ان کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا اور پھر ایک دن اور ان کے دوسرے افسانوی مجموعے کا نام ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا تخلیقی سفر بڑی خوبصورتی اور سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، منزل اگر چہ دور ہے لیکن نظروں سے اوجھل نہیں یہ سفر طے کرتے ہوئے موضوعات بدل چکے ہیں' اسلوب اور ٹریٹمنٹ میں ایک نیا انداز آ گیا ہے' عشق ومحبت کی داستانوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں غالب آ چکی ہیں' آج کی کہانی میں آج کے انسان کی کہانی ملتی ہے' ریاست کے پر آشوب دور کی عکاسی ملتی ہے۔

گذشتہ کئی برسوں سے ریاست جن حالت سے گزر رہی ہے اور عوام کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے سماج اور معاشرے میں ہورہی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں سے جو نتائج سامنے آرہے ہیں گولیوں اور بندوق کا جو چلن ہے' جنسی بے راہ روی کو جو بڑھاوا مل رہا ہے' گمشدہ افراد اور بے نام قبروں کی جو کہانی دہرائی جارہی ہے۔ ہماری سرحدوں کی لکیروں کے ساتھ جو چھیڑ چھاڑ کی جارہی ہے' بے گھر ہوئے لوگوں کا جو درد و کرب ملتا ہے گھر واپس لوٹنے کی چاہت ملتی ہے' یہاں کا افسانہ نگار ان سے ہرگز ہرگز بے خبر نہیں یہ سب باتیں ریاست میں لکھے جانے والے افسانوں میں ملتی ہیں۔ ان افسانوں کے تخلیق کار سماجی' معاشی' عدم مساوات کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں وہ سیاسی بے راہ روی اور رجعت پسندانہ رویوں کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعے ایک ان دیکھی لڑائی لڑ رہے ہیں' بھائی چارے' اخوت اور مذہبی رواداری کی عظمت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہاں کے افسانہ نگار انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے افسانوں کے ذریعے کوشش کر رہے ہیں کہ یہاں کے حالات و واقعات کی صحیح ترجمانی ہو وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں جو نام سامنے آرہے ہیں اُن میں ناصر ضمیر' خالد کرار' شبنم طارق' جنید جاذب' محمد عمر فرحت' ریاض فلک' راجہ یوسف اور نذیر جوہر کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اِن کے افسانے پڑھ کر یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ریاست بھر میں اردو افسانے کا فن ایک نادر' دلچسپ اور منفرد حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہمارا افسانہ رو بہ ترقی ہے' افسانہ پڑھنے والے ابھی اب حقیقت پسندانہ افسانوں میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

خالد کرار کے افسانوں میں جہاں بیان کی شگفتگی نظر آتی ہے وہیں وہ علامتوں اور تشبیہات کے سہارے اپنی بات کو موثر انداز سے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔

ناصر ضمیر ریاست کے نوجوان قلم کاروں میں افادیت کے حامل ہیں، ان کی تحریروں میں سنجیدگی ہے اور شادابی بھی؛

وہ اکثر نئے موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمیٹتے ہیں اور ایک الگ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ طارق شبنم بھی خوب لکھ رہے ہیں اور اپنے افسانوں میں حالات و واقعات کی صحیح ترجمانی کر کے اپنے افسانوں کے سفر میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ جنید جاذب، ریاض فلک، محمد عمر فرحت اور راجہ یوسف افسانوی ادب میں اپنے افسانوں کے ذریعے رنگ بھر رہے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ افسانوں کی وجہ سے ریاست میں افسانہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل آیا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے افسانوی سفر میں موجودہ دور کی خواتین افسانہ نگاروں کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ریاست میں اردو افسانے کو یہ خواتین مالا مال کر رہی ہیں ان کے افسانے زندگی کے متضاد پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے کو نئی جہتوں اور نت نئے تجربوں سے آشنا کرنے والی خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں ترنم ریاض کا نام بھی شامل ہے، ان کی تحریروں سے جو سنگیت ابھرتا ہے ان کے اسلوب میں جو نیا پن ملتا ہے وہ ان کی افسانوی انفرادیت کی دلیل ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں۔ ' مرا رخت صفر، یمبرزل، ابابلیں لوٹ آئیں گی اور تنگ زمین''۔ سیدہ نسرین نقاش نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1987 میں کیا اور ان کا پہلا افسانہ 'ماں' تھا لیکن اشاعت کے تعلق سے ان کا پہلا افسانہ 'دھوکہ' تھا جو ماہنامہ روشن ادب میں 1987 میں شائع ہوا۔ نعیمہ احمد مہجور اب بہت کم افسانے لکھتی ہیں، انھوں نے ماضی میں جتنے بھی افسانے لکھے وہ اچھے افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نگہت فاروق کے افسانوں میں نیا پن ہے اور نئی باتوں کا اظہار بھی ''قہر نیلے آسمان کا'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں شامل اکثر کہانیوں میں انھوں نے آج کے کشمیر کی تصویر ابھاری ہے، زنفر کھوکھر کی پہلی کہانی کا نام تھا 'نسخہ'۔ اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ عنوان ہیں کانچ کی سلاخ، خوابوں کے اُس پار اور عبرت زنفر کھوکھر مختصر کہانیاں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ غیر شعوری طور پر مجھ سے کچھ افسانہ نگاروں کے نام رہ گئے ہیں، ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کرنا رہ گیا ہوگا۔ اس وجہ سے مضمون میں تشنگی کا احساس بھی ابھرا ہوگا، اِس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں، البتہ ایک ایسے شخص کا نام میں ضرور لینا چاہوں گا جو گزشتہ قریب قریب پچاس برسوں سے اچھی بُری کہانیاں لکھ رہا ہے اور جس کے آٹھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اس کا نام ہے نور شاہ.....!!

Noor Shah
14- Lal Ded Colony
Gouripora Link Road
Rawalpora, Srinagar-190005 (Kashmir)

جموں و کشمیر کی معاصر خواتین افسانہ نگار

۔۔۔۔ایک جائزہ

برصغیر میں ریاست جموں و کشمیر اب اردو کا ایک اہم دبستان بن گیا ہے۔ یہاں بولی جانے والی تمام زبانوں میں اردو کو اولیت اور مرکزیت حاصل ہے۔ یہاں کے قلم کاروں نے اپنی اپنی مادری زبانوں کو چھوڑ کر زیادہ تر اسی زبان میں اظہار خیال کیا ہے، جس کے نتیجے میں یہاں اس قدر اردو فکشن پیدا ہوا کہ اس دبستان کی ایک الگ الگ جامع تاریخ بن سکتی ہے۔ ہماری فکشن نگاروں نے شروع سے ہی اردو کی تمام تحریکوں اور رجحانات کا ساتھ دے دیا ہے اور ہمیشہ عصری ضرورتوں کے پیش نظر فکشن تخلیق کرتے رہے۔ جن میں ریاست کی خواتین افسانہ نگار مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر دور کا ادب اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام وصورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ خاصیت ریاست کی معاصر خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے آج کے مسائل کو اپنی کہانیوں کے لیے موضوع کا انتخاب کیا ہے اور زیادہ تر خواتین نے روایتی عشق ومحبت کی داستانیں نیر سراسر تجریدی اور علامتی حکایتیں بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے بیانیہ انداز اختیار کر کے اپنی کہانیوں میں زندگی کے مختلف رنگوں کو فطری انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر ترنم ریاض، نعیمہ احمد مہجور، سیدہ نسرین نقاش، رنفر کھوکھر، ڈاکٹر نکہت نظر، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، واجدہ تبسم، تبسم ضیا، شبنم بنت رشید اور رافعہ ولی وغیرہ ریاست کی اہم معاصر خواتین افسانہ نگار ہیں

جن کی تخلیقات موضوعاتی اور ادبی سطح پر بحث کا موضوع بنی ہیں۔ان افسانہ نگاروں کے یہاں فنی اور موضوعاتی دونوں سطح پر نئی پرانی روایتوں کا حسین امتزاج اور کہانیوں کا نیا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

☆ ڈاکٹر ترنم ریاض: ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کو نئی جہت اور نت نئے تجربوں سے آشنا کرنے والی خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں ترنم ریاض کا نام سہر فہرست ہیں۔ترنم ریاضؔ کا اصلی نام ترنم فریدہ ہے۔آپ ۹ اگست ۱۹۶۳ بمقام سرینگر کشمیر میں تولد ہوئی۔اردو ادب میں ترنم ریاضؔ ایک شاعرہ، ناول نگار، افسانہ نگار، تبصرہ نگار، محقق ونقاد کی حیثیت سے اپنی لیاقت وقابلیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ان کی تصانیف اعلی ادبی معیار کی حامل ہیں۔ترنم ریاضؔ کی تصانیف تا حال جو منصۂ شہود پر آچکی ہیں ان کے نام اس طرح ہیں: افسانے مجموعے: یہ تنگ زمین (1998)، ابابیلیں لوٹ آئیں گی (2000)، یمبر زل (2004)، میرا رخت سفر (2008)، ناول مورتی (2004) برف آشنا پرندے (2009)، نرگس کے پھول، صحرا ہماری آنکھوں میں، شاعری مجموعے: پرانی کتابوں کی خوشبو، بھادوں کے چاند تلے، زیر سبزہ محو خواب (2015)، چاند لڑکی ادبی دنیا میں خاصی پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ترنم ریاضؔ کی بیشتر کہانیوں میں نسائی شعور، نسائی تہذیب وثقافب کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقیات میں مرد اساس معاشرے کے جبر کے خلاف ان کے احتجاج کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔انھوں نے افسانہ بابل، حور، کانچ کے پردے اور میرا پیا گھر آیا میں عورت، اس کی اہمیت، افادیت، اس کے تحفظ اور حقوق پر کھل کر بات کی ہیں۔

☆ نعیمہ احمد مہجور: موجوہ افسانوی منظر نامے میں ایک اہم نام نعمیہ احمد مہجور کا بھی ہے۔آپ ۹ اگست ۱۹۵۵ بمقام ڈل گیٹ بچھوارہ سرینگر کشمیر میں تولد ہوئی۔آپ کے افسانے ریاست کے اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کے تخلیق کردہ افسانے

آگ، سیاہ رات کی چاندنی، اس بستی کی رات اور سفید چاندنی ہیں۔ان کا ایک ناول بہ عنوان ''دہشت زادی'' بھی منظر عام پر آچکا ہیں۔نعمیہ احمد مہجور بھی اپنی کہانیوں میں عورت کو مرکزی حیثیت دیتی ہیں۔ان کے افسانوں میں عورت کے حالات وکوائف سے متاثر ہوتے سماجی وسیاسی حالات ومسائل کے رنگ ہیں تو، وہیں سماجی وسیاسی قید بندیوں سے جہد کرتی اور باغی مزاج کی عورت بھی ہے۔ان کے ناول میں نئی نسل کی تعلیم یافتہ لڑکی کی سرکشی، بے باکی، خود آگہی اور خود اعتمادی کی تصوریں کی جھلک ملتی ہے۔

☆ سیدہ نسرین نقاش: کشمیر میں اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں سید نسرین نقاش کا نام بہت معتبر سمجھا جاتا ہے۔سید نسرین نقاش سرینگر سے تعلق رکھتی ہے۔سید نسرین نقاش کا تخلیقی سفر بہت پرانا ہے۔ان کا پہلا افسانہ ''دھوکہ'' ماہنامہ روشن ادب 1987 میں شائع ہوا ہے۔ان کا افسانوں مجموعہ ''سلگتی لکریں'' منظر عام پر آچکا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کی گھریلوی زندگی کو پیش کیا ہے۔گھریلوی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اکثر ان کے افسانوں کا موضوع ہوتے ہیں۔سید نسرین نقاش ایک باصلاحیت ادیبہ ہیں جن کا قلم بیک وقت شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کے میدان میں اپنے جوہر دکھاتا ہے۔

☆ زنفر کھوکھر: ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں کی کہکشاں کا ایک اور تابندہ ستارہ ہیں زنفر کھوکھر۔زنفر کھوکھر کا تعلق راجوری سے ہے۔ان کی پہلی کہانی ''نصحیت'' ماہنامہ تشکیل 1888 میں شائع ہوئی ہے۔اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے (خوابوں کے اس پار 1999، کانچ کی سلاخ 2003، عبرت 2010 اور ہم سب ایک ہیں 2017) شائع ہو چکے ہیں۔ان کے افسانے آج کل، انشاء تریاق اور شاعر میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ماہنامہ شاعر نے مارچ 2013 میں ان پر گوشہ بھی شائع کیا ہے۔ان کے زیادہ تر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔وہ عورت کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔انھوں نے

اپنے سماج میں عورت کی بدحالی اور تباہ حالی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ عورت کے ایثار اور قربانی کے جذبے کو بھی اپنے متعدد افسانوں میں پیش کیا ہے۔جس کی مثال ان کا ایک نمائندہ افسانہ ''خیرات'' ہیں۔ان کی کہانیوں میں انسانی جذبات ،تعلقات اور سماجی حالات کا بیان بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

☆ ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی: نیلوفر ناز نحوی کا شمار ریاست کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔نیلوفر ناز سرینگر کی رہنے والی ہے۔ان کے بھی اب تک تین افسانوی مجموعے (چنار کے برفیلے سائے2013 ،خاموش آسمان2015 اور روزن پہ میرے چاند2018)منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی کہانیاں ریاست کے مختلف اخبارات اور رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔نیلوفر ناز نحوی کے افسانوں میں مخصوص سماجی وتہذیبی تناظر ،عورت و مرد کے تعلقات ،سیاسی گروٹ ، معاشی بدحالی ،گھریلو مسائل اور ازدورجی زندگی کی ذلتوں کا بیان جا بجا دیکھنے کو ملے گا۔ان کے افسانوں میں عورت مختلف روپ میں دیکھائی دیتی ہے۔کہیں وہ زمانہ جاہلیت کی عورت ہے جو مرد کی بے جا زیادتیاں سہتے ہوئے بھی مرد کو مجازی خدا کا درجہ دیتی ہے۔خوشبو،ایک خط ۔۔ماں کے نام ،بھوک ،خاموش دھڑکن اور بے رنگ خون ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں عورت بحشیت ماں ، بیوی ،بہن اور سہیلی کے طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔

☆ ڈاکٹر نکہت فاروق نظر: نکہت فاروق نظر ریاست کے افسانوی افق پر ابھرتا ہوا ایک اور نام ہے۔ان کا تعلق بھی سرینگر سے ہے۔مقامی جرائد اور رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''فہر نیلے آسمان کا'' 2008 میں منصبہ شہود پر آ گیا۔ان کے افسانوں میں زندگی کے نشیب وفراز اور روزہ شب کے تمام حالات کی ترجمانی ملتی ہے۔ان کے یہاں تہذیبی وقار ،خاندانی میل جول کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور سماجی رشتوں کے درمیان دوری کا احساس ،خونی رشتوں کے ٹوٹتے ہوئے کرب کا اظہار

،نسائی نفسیات کی پیش کش اور سماجی ناانصافی کی شکار عوتوں کے لیے صدائے احتجاج نظر آتا ہے۔جس کی عمدہ مثال ان کا افسانہ ''ریزہ ریزہ وجود'' ہے۔

☆واجدہ تبسم گورکھو: معاصر افسانوی ادب کے منظر نامے پر واجدہ تبسم کا نام بھی کندہ ہے۔واجدہ تبسم بھی سرینگر سے تعلق رکھتی ہے۔ان کی پہلی کہانی ''آہ کے اثر ہونے تک'' روزنامہ چنار 1972 میں شائع ہوئی ہے۔''ڈولتی نیا'' کے عنوان سے 1973 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ایک اور مجموعہ ''آج بھی دل روتا ہے'' زیر ترتیب ہے۔عورتوں کے مسائل،عورتوں کی کی جذباتی دنیا،اس کی خوشیاں ،اس کے غم،اس کی محبت،اس کی ممتا،اس پر ہونے والے مظالم،اس کو مجبور کرنے والی باتیں اور اس کی سماجی حیثیت وقار کی مکمل تصویر کشی واجدہ تبسم کے افسانوں میں ملتی ہے۔ایک عورت کا سب سے انمول لمحہ ماں بننے کا ہوتا ہے اپنے وجود سے ایک نئے وجود کی تخلیق ہی اس کی تکمیل کا سبب ہوتی ہے۔ان کا افسانہ ''ماں'' عورت کی اس نفسیات کو قاری کے سامنے رکھ دیتی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز کوثر: موجودہ افسانوی منظر نامے میں ایک اہم نام ڈاکٹر ممتاز کوثر کا بھی ہے۔ان کا تعلق وادی چناب سے ہے۔اب تک ان کی دو کتابیں ''افسانے کی جمالیات'' (تحقیقی مقالہ) اور ''برف کی ایک رات'' (افسانوں کا مجموعہ) ہماری ادبی وراثت کا حصہ بن چکی ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کی گھریلوی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔گھریلوی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اکثر ان کے افسانوں کا موضوع ہوتے ہیں۔افسانہ ''برف کی ایک رات'' میں انھوں نے عورت کی نفسیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے افسانے کسی خاص نظریے یا موضوع کے پابند نہیں ہیں۔اپنے ارگرد ہونے والا کوئی واقعہ جوان کے دل کو چھو جاتا ہے،ان کے قلم کو حرکت میں لے آتا ہے اور کہانی کو جنم دیتا ہے۔ان کے کردار ان کے آس پاس پائے جانے والے عام انسان ہوتے ہیں۔وہ خوابوں کی دنیا سے اپنے کردار نہیں چنتیں۔

☆تبسم ضیا: ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک نام تبسم ضیا کا بھی ہے۔تبسم ضیا اگرچہ کم لکھتی ہیں لیکن خوب لکھتی ہیں۔

شہر خاص سے تعلق رکھتی ہے۔ان کا پہلا مجموعہ ''رمق 2016 ''میں شائع ہوا ہے۔مقامی روزناموں میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں زندگی بالخصوص عورتوں کی زندگی کے مختلف جہات پر توجہ ملتی ہے۔عورت کے استحصال اور بڑھتے جہیز کے لین دین کے ساتھ اس کے ذہنی انتشاز ،الجھنوں اور طبقہ نسواں کی بکھرتی زندگی کے مسائل کا بھرپور احاطہ ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔انھوں نے عورتوں کے دکھ سکھ ،خوشیوں اور بنتے بگڑتے رشتوں کو اپنے مشاہدے اور تخیل سے اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔مثلاً۔''گھر''،''پرکھ''،''پرس''،اور''ضد''وغیرہ جیسی ان کی کہانیاں ہمیں آج کی بدلتی ہوئی زندگی اور نئے سماجی تناظر سے روبرو کراتی ہیں۔

☆ رافیہ رسول مغموم: رافیہ رسول مغموم کا شمار ریاست کی معروف فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔آپ کا تعلق سرینگر کے ڈلگیٹ علاقے سے ہے۔آپ کا ناول ''پہچان انسو کی'' منظر عام پر آچکا ہے۔آپ بھی عورترں کی ہو کہانیاں لکھتی ہے مگر ان کی سوچ کا زاویہ مثبت ہے اور وہ انسانی رشترں کی اہمیت پر اصرار کرتی ہیں اور ان کو ملحوظ رکھنے کی شعوری کوشش کرتی ہیں۔رافیہ کے بیشتر افسانوں میں موارے سماج میں عورتوں کے استحصال ،عورتوں کے جذبات و محسوسات کی عکاسی نظر آتی ہے۔نیز عورتوں کے درد وغم ،ظلم وستم ،داخلی اور خارجی کیفیات پر بھی ان کی نگاہ رہتی ہے۔

☆شبنم بنت رشید: شبنم کا تعلق جنوبی کشمیر کے پہلگام علاقہ سے ہے اور کچھ عرصہ سے ان کی افسانوی کاویشش اخبارات کی زینت بن رہی ہیں۔خاص ک اخبار کشمیر اعظمی کے ہفتہ واری ادب نامہ میں ان کی متعدد کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔جو نہ صرف فنی اعتبار سے چست ورست ہیں بلکہ ان کا موضوعاتی تنوع قاری کو غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔شبنم کی

کہانیوں میں جہاں عالمی سطح پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات سے روایتی سماج کی اکھاڑ پچھاڑ کا ذکر ملتا ہے۔ وہیں تصادم آرائیوں کے حامل خطوں میں ابھرنے والی نفسیات اور عام انسان پر پڑنے والے اس کے اثرات کا واضح نقشہ نظر آتا ہے، جسے وہ خوبصورت زبان اور بیان کی مدد سے حقیقی رنگوں میں کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں۔

میت کور: ریاست کی خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک نام میت کور کا بھی ہے۔ آپ جموں سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ میت کور پیشے سے انجینئر ہیں۔ ان کے افسانوں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے مسائل کو نہیں بلکہ اپنے مالک اور اپنے سماج کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں۔ انھوں نے عورت کے ہر روپ کو دیکھا ہے اور اس کے درد کو محسوس کیا ہے۔ افسانہ ''بوجھل قدم'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ میت کور کے بیشتر افسانوں میں عورتوں کے استحصال، عورتوں کے جذبات ومحسوسات کی عکاسی نظر آتی ہے۔

ان کا انداز بیان نہایت دلکش اور پراثر ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں منظر نگاری اتنی مکمل ہوتی ہے کہ پورا منظر یا وہ شخصیت جسے وہ پیش کرتی ہیں، آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

رافعہ والی: رافعہ والی ریاست کے افسانوی افق ابھرتا ہوا ایک اور نام ہے۔ آپ کا تعلق شمالی کشمیر سے ہے۔ انھوں نے افسانے لکھنے کی ابتدا کافی کم عمری سے کردی ہے۔ ان کے افسانے انسانی اور جذباتی رشتوں کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اختصار ہے یعنی وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کا قلم کہیں کہیں بے باک بھی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سماج کو برہنہ کرکے قاری کے سامنے لانا چاہتی ہیں۔ انھوں نے عورت کی نفسیات، عورت کو اس مرد اساس معاشرے میں اس کی مظلومیت اور کچلی ذات کو بھی اپنے متعدد افسانوں میں پیش کیا ہے۔

ریاست کے افسانوی افق پر اور بھی کئی خواتین افسانہ نگاروں کے نام ہیں جن کے قلم فعال ہیں اور اردو افسانوی ادب میں اضافہ کر رہی ہیں۔ ان میں مینا یوسف، زبیدہ گلزار، شمیمہ صدیقی اور عذرا بنت گلراز کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ نوجوان قلم کار اردو افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کروا رہی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست کے منظرنامے میں خواتین افسانہ نگاروں کا مستقبل تابناک ہے۔

سہیل سالم
رعناواری سرینگر
9697330636
salimsuhail3@gmail

شہر

ڈاکٹر ترنم ریاض

پلاسٹک کی میز پر چڑھ کر سونو نے نعمت خانے کی الماری کا چھوٹا سا کواڑ وا کیا تو اندر قسم قسم کے بسکٹ، نمک پارے، شکر پارے اور جانے کیا کیا نعمتیں رکھیں تھیں۔ پل بھر کو وہ ننھے سے دل پر کچو کے لگاتا ہٹا غم بھول کر مسکرا دیا۔ اور نائٹ سوٹ کی لمبی آستین سے سوکھے ہوئے آنسوؤں بھرے رخسار پر ایک اور تازہ بہا ہوا آنسو پونچھ کر اس نے بسکٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لے لیا اور اپنے پانچ سالہ وجود کا بوجھ سنبھالتا ہوا میز سے نیچے اتر آیا۔ اسے بھوک بھی بہت لگی تھی۔ آج صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا، اس کی چھوٹی سی اڑھائی برس کی بہن ثوبیہ بھی صبح سے بھوکی تھی۔ سارا دن وہ مسہری پر لیٹی اپنی ممی کو پکار پکار کر تھک گئی تھی۔ اور بہت زیادہ روتے رہنے کے باعث نڈھال سی ہو کر اس نے اپنا گھنگھریالے بالوں والا ننھا سا سر اپنی امی کے پھیلے ہوئے بازو پر رکھ چھوڑا تھا.... دن بھر شاید وہ سوتی رہی تھی اور کچھ دیر پہلے ہی اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

اس شہر میں آئے انہیں صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔

امان کو بہت عرصے سے اس شہر میں اپنی تبدیلی کروانے کی خواہش تھی لیکن اس میں بس ایک ہی پریشانی تھی کہ رہائش کا انتظام نہایت مشکل کام تھا۔ اُس کے قصبے کے انوار صاحب بھی اس کمپنی میں کام کرتے تھے مگر وہ ہیڈ آفس سے وابستہ تھے اور شہر میں رہائش پذیر تھے۔ رہائش بھی کمپنی کی طرف سے ملی ہوئی تھی، کیونکہ وہ پچیس برس سے اس دفتر میں تھے۔ اُس کے

بعد آنے والے ملازمین میں سے بہت کم کو فلیٹ میّسر آیا تھا۔ غیر شادی شدہ لوگ تو ایک کمرے والی رہائش میں دو، یا تین تین کے حساب سے ہوسٹل کی طرح کمرہ بانٹ لیتے تھے مگر فیملی والے ارکان کے لیے یہ مسئلہ سب سے پیچیدہ تھا۔

امان اپنے قصبے میں کمپنی کا برانچ منیجر تھا۔ انوار صاحب ہر تین ماہ کے بعد اپنی کمپنی کا کوئی کام نکال کر اپنے آبائی گھر آتے۔ بزرگ والدین سے ملاقات بھی ہو جاتی اور کمپنی کا کام بھی بنٹا لیتے۔

اس بار انوار صاحب اپنے ساتھ امان کے لیے کچھ سپنے بھی لے آئے تھے۔ بڑے شہر میں رہنے کے۔ بچوں کو بڑے بڑے سکولوں میں تعلیم دلوانے کے اور ہیڈ آفس میں رہ کر ترقی کے نئے راستے وا ہونے کے۔

وہ ریٹائرمینٹ لے رہے تھے اور امان کے لیے ٹرانفسر کی بات بھی کر آئے تھے۔

امان اگر بروقت نہ پہنچتا تو اُسے کچھ برس انتظار کرنا پڑتا اور فیملی فلیٹ اُسے جب ہی ملتا جب فیملی ساتھ ہوتی ورنہ اُسے بیچلر رومز میں رہنا تھا۔ انوار صاحب نے فلیٹ کی چابی ابھی دفتر میں جمع نہیں کرائی تھی۔ وہ یہ کام امان کی موجودگی میں کرانا چاہتے تھے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر اُن کی عزت کرتے تھے، اُنہیں یقین تھا کہ وہ اُن کی بات مان لیں گے۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا آنے کی کوشش کرتا، وہ کسی کی علمیت سے پیشتر امان کے حق میں فیصلہ چاہتے تھے۔

امان نے دو دن کے اندر ساری تیاریاں مکمل کر لیں اور معؔ بابر اور بچوں کے شہر روانہ ہو گیا۔

انوار صاحب کا فلیٹ ۱۴ منزلہ عمارت کا سب سے اوپری فلیٹ تھا۔ عمارت کی ہر منزل پر تین تین فلیٹ تھے مگر سب سے اوپر والی منزل میں یہی ایک فلیٹ تھا۔ کیونکہ ایک طرف ڈش انٹینا تھا اور دوسری طرف پانی کی ٹنکیاں۔ درمیان میں یہ ایک فلیٹ ہی بن پایا تھا۔ اس کے اوپر بڑا سا کشادہ ٹیرس تھا جس میں تقریبات وغیرہ ہوا کرتیں۔ وہاں سے نیچے دیکھنے پر سارا

شہر دلہن کے ستارے لگے آنچل کی طرح نظر آتا۔

اس سے نیچے کے تین فلیٹس میں سے دو آباد تھے اور ایک پر کچھ تنازعہ چل رہا تھا۔ ایک فلیٹ کے مکین کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ایک میں امان کی ہی کمپنی میں کام کرنے والے و کرم بھسین رہتے تھے۔

بابرا کو فلیٹ اور امان کو شہر بہت پسند آیا۔ فلیٹ کشادہ تھا۔ تین خوابگاہوں، ڈرائنگ روم اور باورچی خانے پر مشتمل۔ ہر کمرے کے ساتھ ملحقہ غسل خانہ، اور لباس بدلنے کے لے چھوٹا سا احاطہ۔ اونچی چھتیں، بڑی بڑی کھڑکیاں، لمبے لمبے دروازے۔ تین دن میں فلیٹ سج گیا۔ ضرورت کا سب سامان آ گیا سوائے ٹیلیفون کے۔ ٹیلیفون کی فیس پچھلے تین ماہ سے ادا نہیں ہوئی تھی اور ان مہربانیوں کے بدلے امان کو انوار صاحب کے لیے اتنا تو کرنا ہی تھا۔ ورنہ خوامخواہ انوار صاحب کی گریجویٹی وغیرہ متاثر ہوتی۔ بلکہ امان کو تو کئی مہینے کا بجلی کا بل بھی بھرنا پڑا تھا جب جا کر بجلی کا کنکشن دوبارہ جوڑا گیا۔ ٹیلیفون کا بل ادا کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ امان نے پہلے دن آفس جوائن کرنے کے بعد دوارہ آفس کا رخ تک نہیں کیا تھا کہ بغیر بجلی کے اس شہر میں ایک دن کے لیے بھی رہنا مشکل تھا اور سارا وقت اُسے ادھر اُدھر بھٹکنا پڑا تھا۔

کوئی پانچویں دن امان دفتر گیا کہ بھسین صاحب کے فلیٹ میں اُس کے لیے فون آیا تھا۔ اُسے سائٹ پر جانا تھا اور واپسی دوسرے دن کی تھی۔ وہاں کچھ ایسا کام پڑ گیا کہ امان دوسرے دن نہ آ سکا۔

صبح دروازے کی گھنٹی بجی تھی تو سونو کی آنکھ اُسی آواز سے کھل گئی تھی۔ ممی اور ثوبیہ سو رہی تھیں۔ سونو دروازے تک گیا اور اس نے دروازے کی نچلی چٹخنی بھی کھولی تھی مگر میز پر کھڑے ہونے کے باجود اُس کا ہاتھ دروازے کے اوپر والی چٹخنی تک نہ پہنچ سکا۔

''جی کون ہے؟'' اُس نے پکارا بھی تھا مگر باہر سے کوئی جواب نہ آیا۔ آنے والے نے

شاید اُس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اور دروازہ نہ کھلنے پر لوٹ گیا تھا۔

''ممی۔ کوئی گھنٹی بجا رہا ہے۔ ممی..... ممی۔'' اُس نے کئی بار ممی کو پکارا تھا مگر ممی جانے آج کیسی نیند سو رہی تھیں۔ جاگ ہی نہیں رہی تھیں۔

''ممی...... ممی جی...... کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔'' اُس نے اونچی آواز میں پکارا تو ثوبیہ نے ابروؤں کے رخ پر خمیدہ پلکوں والی منی منی آنکھیں کھول دیں۔ اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بھائی کو ممی پکارتے سن کر خود بھی ممی پکارنا شروع کر دیا۔

مگر ممی بول ہی نہیں رہی تھیں۔ ممی کے دہانے کے چاروں طرف کوئی سفید سی چیز جمی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب طرح سے پھیلے ہوئے تھے۔

ثوبیہ نے ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر رونا شروع کر دیا۔

''چپ ہو جانا۔ روتی کیوں ہے۔'' سونو نے جھلا کر کہا تو ثوبیہ اور زور زور سے رونے لگی۔

''ممی۔ ممی اُٹھیئے نا۔'' سونو نے پھر ماں کو جانے کی کوشش کی۔ جب تک دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔

''کون ہے...... '' وہ دروازے کے قریب جا کر اور اونچی آواز میں بولا۔ کوئی جواب نہ آیا۔

وہ واپس کمرے میں آیا۔ ثوبیہ باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ سونو کچھ دیر ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر روتی ہوئی بہن کو بغور دیکھنے لگا۔

''ممی'' اُس نے ممی کو پوری طاقت سے جھنجھوڑا مگر ممی بے حس و حرکت پڑی رہیں۔

وہ کچھ دیر گُم سُم سا بیٹھا رہا۔ پھر ثوبیہ کے قریب جا کر اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھے۔

''نہیں رونا ثوبی۔ ممی سو رہی ہیں۔'' مگر ثوبی تھی کہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''چپ ہو جا۔'' وہ چیخا اور ساتھ ہی دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

جانے کب تک دونوں بہن بھائی روتے رہے مگر امی نے چپ ہی کرایا نہ کچھ بولیں۔ ثوبیہ کوئی گھنٹہ بھر رونے کے بعد تھک کر سوگئی۔

وہ سوگئی تو سونو پھر ماں کے قریب گیا۔ اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر دائیں بائیں ہلانے لگا۔

''ممی'' اسنے زور زور سے ممی کا سر ہلایا ''ممی...... ممی جی'' اس نے آنسوؤں میں بھیگی آواز میں محبت گھول پکارا۔ ممی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اُٹھ کر وہ ڈرائنگ روم چلا گیا۔ پردہ سرکا کر کھڑی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔

سامنے ایک بڑا سا پارک تھا جس میں چھوٹے چھوٹے کھلونوں جیسے رنگ برنگے بچے کھیل رہے تھے۔ پارک میں کئی طرح کے چھوٹے بڑے جھولے لگے ہوئے تھے اِدھر اُدھر آئس کریم اور ویفرس کے پیکٹ والے اپنی چھوٹی چھوٹی ہاتھ گاڑیاں لیے ہوئے گھوم رہے تھے ایک ریڑھی پر نہایت ننھی ننھی بوتلوں میں کولڈ ڈرنکس سجی ہوئی تھیں پارک کے دوسرے جانب لمبی سی سڑک پر چھوٹی چھوٹی بے شمار گاڑیاں بھاگ رہیں تھیں۔ سونو نے یہ ساری چیزیں اس قدر چھوٹی جسامت میں آج سے پہلے کبھی نہ دیکھیں تھیں۔ اُس کے ذہن میں عجیب عجیب سوال اور خیال اُبھرنے لگے۔ وہ کمرے میں لوٹ آیا۔

''ممی جی۔'' اُس کے سینے سے درد بھری کراہ نکلی۔ اور اُس نے اپنا چھوٹا سا سر ممی کے سینے پر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔ اُس کے آنسوؤں سے ممی کے شب خوابی کے لباس کا گریبان بھیگ بھیگ گیا مگر ممی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ رو رو کر جب وہ ہلکان ہو گیا تو جانے کب اسے نیند آ گئی۔

جانے کتنا وقت وہ سوتا رہا۔

''چھو۔ چھو۔'' نیند میں اس کے کانوں میں ثوبیہ کی آواز پری تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

''چھوچھو'' ثوبیہ نے ممی کی طرف سے نظر ہٹا کر بھائی کو دیکھ کر کہا۔

''سوسو کرنا ہے؟'' سونو نے پوچھا تو اُس نے سر اُوپر سے نیچے ہلایا۔ سونو نے غسل خانے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

باہر شام ہو چکی تھی۔

ثوبیہ باتھ روم سے آکر ماں کے پاس لیٹ گئی۔

''ممی...... مم...... ممی'' ثوبیہ نے اپنی شہادت کی انگلی سے ماں کی آنکھ کھولنے کی کوشش کی...... وہ ناکام ہو کر پھر رونے لگی۔

ممی ی ی...... '' وہ ممی کو پکارتی ہوئی ہچکیاں لینے لگی۔

سونو بہن کو بے بسی سے دیکھتا رہا۔

''می اُٹھئے نا...... ممی جی...... ثوبی رو رہی ہے۔ اُسے بھوک لگی ہے۔''

وہ گلوگیر آواز میں ماں سے مخاطب ہوا...... اُسے خود بھی بھوک لگی تھی مگر جب تک اُس نے ثوبیہ کی بھوک کا ذکر نہ کیا اس طرف اُس کا خیال نہ گیا تھا۔

اب اُسے بھوک کا احساس ہونے لگا۔

وہ ماں کے پاس سے اُٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ تمام برتن دھلے دھلائے رکھے تھے۔ کسی میں کچھ کھانے کو نہ تھا۔

اُس نے ریفریجریٹر کھولا...... اُس میں سیب رکھے تھے...... وہ دو سیب اُٹھا کر کمرے میں آ گیا۔

ایک سیب کو خود کترنے لگا اور دوسرا ثوبیہ کو پکڑا دیا۔ ثوبیہ اسے کھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اُس کے منھ میں اُگے آٹھ دانت سیب کے سخت چھلکے کے ساتھ انصاف نہ کر سکے اور

وہ محض سیب کی سطح پر ایک آدھ نشان لگا رک رہ گئی اور چپ چاپ بھائی کو دیکھنے لگی۔ سونو نے سیب کا ایک ٹکڑا توڑ کر دیا تو وہ اُسے چبانے کی کوشش میں منہ کے اندر ادھر اُدھر گھماتی رہی اور آخر کار نگل گئی۔

دونوں سیب ختم ہو گئے تو سونو فرج میں پڑا آخری سیب اُٹھا لایا...... کچھ دیر دونوں بہن بھائی سیب پر زور آزمائی کرتے رہے۔ اس سے فارغ ہو کر پھر ممی کو جگانے کی کوشش کرنے لگے۔

ممی کچھ نہ بولی تو وہ رو رو کر ممی کو ہلانے لگے۔ گھر میں اتنی گرمی تھی مگر ممی کا بدن ایک دم ٹھنڈا پڑا ہوا تھا...... پتہ نہیں کیوں۔

پھر کسی وقت انہیں نیند آ گئی۔

دوسری صبح بھی ممی نہیں اُٹھیں۔ دروازے کی گھنٹی دو بار بجی تھی۔ جس سے سونو جاگ گیا تھا۔

''جی...... ی ی...... کون ہے۔'' کوئی جواب نہ آیا۔ شاید مضبوط دیواروں اور بھاری دروازے کے اُس پار اُس کی کم سِن اور آواز پہنچ نہیں پائی تھی اور آنے والا پھر لوٹ گیا تھا۔

ثوبیہ نے جاگتے ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ اور ممی کے پاس جا کر زور زور سے چیختے ہوئے رو رو کر جب مایوس ہو گئی تو ہچکیاں لیتی ہوئی باہر آ گئی......

اُس کا پھول سا چہرہ کُمھلا گیا تھا۔

باورچی خانے میں سونو ریفریجریٹر کھولے بغیر اندر دیکھ رہا تھا۔ پرسوں کا پڑا ہوا دودھ پھٹ چکا تھا۔ ثوبیہ کو قریب دیکھ کر اُس نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''دُودُو پیئے گی۔'' اُس نے ممی کی طرح پوچھا تھا۔

''ہوں۔'' وہ زور زور سے سر ہلا کر بولی۔

اُس نے پھٹا ہوا دُدھ چمچ سے ثوبیہ کے فیڈر میں ڈالنے کی کوشش میں بہت سارا دودھ گرا کر تھوڑا سا ڈالنے میں کامیابی حاصل کی اور فیڈر بہن کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا۔

ثوبیہ وہیں فرش پر چت لیٹ کر دودھ پینے لگی۔ جب پھٹے ہوئے دودھ کا کوئی ٹکڑا ربر کے چھید کو بند کرنے لگتا وہ پیر پٹخ پٹخ کر پوری طاقت سے دودھ پینے کی کوشش کرنے لگتی اور رونے لگ جاتی پھر خود ہی چُپ ہو جاتی۔

سونو نے دودھ کے کچھ بچے ہوئے چمچ خود بھی پیئے اور ثوبیہ کے پاس جا بیٹھا...... بوتل خالی ہوئی تو ثوبیہ اُٹھ کر بیٹھ گئی...... پھر کھڑی ہو کر ممی ممی پکارتی ہوئی خوابگاہ میں چلی گئی۔

سونو بھی کمرے میں آ گیا۔ اور کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر ماں کو دیکھنے لگا۔ ممی کی شکل آج اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

مسز بھسین کی جز وقتی ملازمہ صبح اوپر آئی تھی تو کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا...... دراصل اماں نے اُن کے ہاں فون کیا تھا کہ بابر کو بتا دیں وہ ایک دن اور رُک گیا ہے اور کل آ جائے گا۔ کیونکہ بابر بہت جلد گھبرا جاتی ہے...... ملازمہ سے دروازہ نہ کھُلنے کی خبر سن کر مسز بھسین نے سوچا تھا کہ پڑوسی کہیں گھومنے گئے ہوں گے۔ یا شاید سو رہے ہوں۔ یا جو بھی......

''ثوبی! آ جا اندر بیٹھیں۔'' سونو نے ثوبیہ سے کہا۔

''کھڑکی سے باہر دیکھیں گے۔'' وہ سر اوپر سے نیچے اثبات میں ہلا کر بولا......

''نہیں...... ممی پاش......'' اُس نے جھٹکے سے سر نفی میں ہلایا۔

''ممی تو بولتی ہیں نہیں...... تو میرے پاس آ جا۔'' وہ اداس ہو کر بولا۔ اس کا چہرہ آج پیلا نظر آ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر پیڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

''آ نا ثوبی......آ جا''وہ دیر تک کہنے لگا...... ثوبیہ ماں کے پھیلے ہوئے

بازو پر سر رکھے اپنا انگوٹھا چوستی رہی اور سر نفی میں ہلا ہلا کر بھائی کو دیکھتی رہی......

سونو اس کے قریب جا کر اسے اٹھانے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ ممی کے پاس سے خراب سی بو آ رہی تھی۔ ممی نہائی نہیں نا کل سے...... کپڑے بھی نہیں بدلے...... ہم بھی نہیں نہائے...... اس نے اپنا گریبان سونگھا...... وہاں اُسے پرسوں کے لگائے ہوئے بے بی پاوڈر کی ہلکی سی مہک آئی...... اس نے پھر ممی کی طرف دیکھا...... ممی کی شکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ایک دو الٹے قدم اٹھاتا ہوا دیوار سے لگ گیا۔ اس کی نظریں ماں کے چہرے پر گڑھی تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچ گیا...... اور دیوار سے پھسلتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں عجیب قسم کا خوف سا چھا رہا تھا۔ اسے نیند بھی آ رہی تھی۔ مگر وہ پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ آنکھ لگنے لگتی تو فوراً آنکھیں کھول کر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگتا...... دور بیٹھا ہوا۔ وہاں سے ماں کے تلوے نظر آ رہے تھے اور پھر ماں کا باقی جسم۔ بعد میں چہرہ۔ ٹھوڑی سے شروع ہوتا ہوا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ دیے۔ اور...... پھر پتا نہیں کب وہ دیوار سے لگا لگا فرش پر آ گیا۔ اس کے گھٹنے اس کے سینے سے لگے ہوئے تھے اور وہ سو چکا تھا۔

صبح پھر دروازے کی کال بیل لگاتار کچھ پل بجی تو وہی بیدار ہوا۔ دروازے تک گیا اور بے چارگی سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ منٹ بعد لوٹ آیا...... گھر میں ہوتا تو کھڑکی سے نانی کو آواز لگاتا۔ یہاں تو نہ وہ دروازہ کھول سکتا تھا نہ کھڑکی۔ کھڑکی کھول بھی لیتا تو اس کی آواز کون سن پاتا کہ کھڑکی سے نظر آنے والے لوگ اس کی آواز کی رسائی سے بہت دور تھے۔

آج ثوبیہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ دروازے پر ٹھہر کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ماں کا چہرہ بغیر پانی کے گلدان میں پڑے کئی دن پرانے پھول سا لگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ماں کے کچھ قریب جا کر غور سے دیکھنے لگا ممی کی شکل بدل گئی تھی۔ یہ شکل کسی اور کی تھی۔ میلے سے

مٹیالے چہرے والی...... اس کی ممی تو گوری تھی...... تو کیا یہ اس کی ممی نہیں تھی...... تو کیا اس کی ممی کی شکل کو کچھ ہو گیا ہے...... یا...... یا یہ کوئی اور ہے۔ کوئی عجیب سی شے...... انسان جیسی کوئی شے......

ذہن میں اس خیال کے آتے ہی وہ زور سے چیخ پڑا۔ ثوبیہ نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور رونے لگی۔ وہ چیختا ہوا کمرے سے باہر بھاگا اور ڈرائنگ روم کے لمبے صوفے کے عقب میں جا چھپا۔ اس کا چھوٹا سا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور آنکھوں سے موٹے آنسوں بہہ رہے تھے۔ ثوبیہ کچھ دیر روتی رہی پھر اُٹھ کر بھائی کو ڈھونڈنے لگی۔

''بیا۔ بیا'' وہ باورچی خانے میں گئی اور روتے روتے بھائی کو پکارنے لگی۔ وہاں اُسے نہ پا کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

''بیا۔آ۔آ'' اس نے نحیف سی آواز میں پکارا۔

سونو صوفے کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے خوفزدہ دل میں احساسِ ذمہ داری نے قوت بھر دی۔ بہن کو دیکھ اس کے قریب چلا گیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ثوبی کو بہت تیز بخار ہے۔

''بیّا۔ پانی'' وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔

''تجھے بخار ہے...... آجا۔ ادھر لیٹ جا...... میں پانی لاتا ہوں۔''

اس نے صوفے پر چڑھنے میں بہن کی مدد کی اور باورچی خانے کی طرف گیا۔ خوابگاہ کے قریب سے گذرتے وقت اس نے ایک ادھوری سی نظر کمرے کی طرف تیزی سے ڈالی اور ریفریجریٹر کے پاس چلا گیا اور بوتل نکال کر اسے گلاس میں انڈیلنے لگا۔ ساری بوتل خالی کر کے ہی کہیں گلاس بھر سکا تھا۔

گلاس اور چمچہ لیے وہ بہن کے پاس آگیا اور اُسے دھیرے دھیرے پانی پلانے لگا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ چمچ وہ خود بھی پیتا رہا۔

''بھوک لگی ہے؟'' اس نے نہایت محبت سے ثوبیہ سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

صبح جب دروازے کی گھنٹی سن کر سونو بے بسی سے پلٹ آیا تھا اس وقت مسٹر بھسین کے ہاں پھر امان نے ٹیلی فون کیا تھا۔ اور پھر مسز بھسین نے اپنی جذوقتی ملازمہ کو اوپر روانہ کیا تھا جو لگاتار تین چار گھنٹیاں بجا کر لوٹ آئی تھی۔

ثوبیہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر نڈھال پڑی تھی۔

سونو ذمہ داری بھائی کی طرح اس کے قریب بیٹھا تھا۔ بیچ بیچ میں دونوں اونگھ لیتے۔ شاید مسلسل نقاہت یا رات بھر گھٹی ہوئی آلودہ فضا میں رہنے کے باعث ان کی ایسی حالت ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی سونو سر گھما کر چور نظروں سے بیڈ روم کی طرف دیکھتا اور جلدی سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ وقفے وقفے سے اس کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

اس بار ثوبیہ جاگی تو پھر رونے لگی۔

''دُودھ پیئے گی ثوبی؟'' اس نے آواز میں پیار بھر کر کہا۔

''مدو دودھ تو ہے ہی نہیں۔ اچھا ٹھہر جا میں اور دیکھتا ہوں۔'' ثوبیہ نے کچھ نہ کہا اسے خود بھی بہت بھوک لگ رہی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا اور پلاسٹک کی میز کھینچ کر نعمت خانے کی الماری کے ٹھیک نیچے تک لے گیا۔

بسکٹ کا ڈبہ لے کر جب وہ خوابگاہ کے باہر سے گذرا تو اس نے بے اختیار سا ہو کر اندر نگاہ دوڑائی حالانکہ وہ وہاں سے سیدھا ڈرائنگ روم میں بھاگ آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے پتہ تھا اندر اس کی ممی نہیں۔ پتہ نہیں کون ہے اور کیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ بیڈ پر پڑی ہوئی ممی جیسی کوئی چیز جیسے دب کر پھیل گئی تھی۔ آنکھیں جیسے بڑے بڑے ابھرے ہوئے دائروں

میں دھنسی پڑی تھیں۔ اس چیز کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ جانے کس رنگ کے تھے......
دوسرے ہی پل اس نے منھ دوسری طرف موڑا اور پوری طاقت لگا کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔
شاید وہ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا مگر بخار میں چپ چاپ لیٹی ہوئی بہن نے اس کے حواس کو قابو میں رکھا۔ چیخ اس نے ننھے سے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔
وہ بہن کے قریب چلا گیا اور باچھیں کھول کر مسکرانے لگا تو اس کے سوکھے سوکھے لب سفید ہو رہے تھے۔ ''بسکٹ۔ لایا ہوں'' وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔
''کھائے گی۔'' وہ پیار سے پوچھنے لگا۔ اور ثوبیہ ٹکر ٹکر بھائی کو دیکھتی رہی۔

میرا پیا گھر آیا

بسکٹ کا ڈبہ لے کر جب وہ خوابگاہ کے باہر سے گذارتو اس نے بے اختیار سا ہو کر اندر نگاہ دوڑائی حالانکہ وہ وہاں سے سیدھا ڈرائنگ روم میں بھاگ آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے پتہ تھا اندر اس کی ممی نہیں۔ پتہ نہیں کون ہے اور کیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ بیڈ پر پڑی ہوئی ممی جیسی کوئی چیز جیسے دب کر پھیل گئی تھی۔ بند آنکھیں جیسے بڑے بڑے ابھرے ہوئے دائروں میں دھنسی پڑی تھیں۔ اس چیز کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ جانے کس رنگ کے تھے......

دوسرے ہی پل اس نے منھ دوسری طرف موڑا اور پوری طاقت لگا کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

شاید وہ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا مگر بخار میں چپ چاپ لیٹی ہوئی بہن نے اس کے حواس کو قابو میں رکھا۔ چیخ اس نے ننھے سے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔

وہ بہن کے قریب چلا گیا اور باچھیں کھول کر مسکرانے لگا تو اس کے سوکھے سوکھے لب سفید ہو رہے تھے۔ "بسکٹ۔ لایا ہوں" وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کھائے گی۔" وہ پیار سے پوچھنے لگا۔ اور ثوبیہ ٹکر ٹکر بھائی کو دیکھتی رہی۔

میرا پیا گھر آیا

ڈاکٹر ترنم ریاض

''کہاں سے آ رہی ہو تم؟''

شمع کو باہر سے آتا دیکھ کر شہیر نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اور شمع اسی کی طرف مسلسل دیکھتے ہوئے صوفے بیٹھ گئی تھی۔

''پانی بیگم صاحبہ!'' اس نے ملازمہ کے ہاتھ سے پانی لے لیا۔ ایک گھونٹ بھرا اور شہیر کی طرف دیکھتی رہی۔ حسبِ معمول اسے شہیر کی بدزبانی بلکہ فحش کلامی کو سنتے اور ان سنا کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف لباس تبدیل کرنے جانا چاہیے تھا۔ مگر جب شہیر نے جملے کا آخری حصہ ادا کیا تو اس میں کچھ مختلف سے تاثرات کی آمیزش تھی 'کہاں سے آ رہی ہو تم'...... گرجتا ہوا حقارت بھرا لہجہ...... آ رہی ہو تم تک آتے آتے ایک شکوے بھرے سوال پر ختم ہوا...... یا پھر...... شاید شمع کو ہی ایسا محسوس ہوا ہو...... کہ برسوں کے بعد بھلا اچانک ایسے...... کیسے۔

شمع نے گلاس لبوں سے لگا رکھا تھا۔ کانچ کے بڑے شفاف گلاس نے اس کی آدھی ٹھوڑی اور پوری ناک کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور گلاس کے اوپری کنارے کے بالکل قریب سے اس کی دو بڑی بڑی آنکھیں شہیر پر مرکوز تھیں۔ مگر وہ پانی نہیں پی رہی تھی۔

''انسان کو زندگی ایک بار ملتی ہے شمع۔ ایک ہی بار۔ ہوسکتا ہے میری زندگی ضائع ہو جائے۔ یا میں۔ اس زندگی کو ضائع کر دوں۔ تم خود ہی سوچو۔ مجھے کیا رشتوں کی کمی ہوگی۔

کسی چیز کی کمی ہے مجھے؟۔بات باہمی سوجھ بوجھ کی ہوتی ہے۔معیار کی ہوتی ہے۔تم میرے معیار پر بالکل پوری اترتی ہو۔تمہاری سوچ میری سوچ کے عین مطابق ہے۔''

وہ سر جھکائے سنا کرتی۔معیار۔کس کا معیار زیادہ اہم ہے۔اسے خیال آتا مگر وہ اس پر بالکل نہ سوچتی۔وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوتا تو شمع رک رک کر بولتی۔

''صحیح کہہ رہے ہیں۔آپ۔مگر ہمارے دونوں بھائی نہیں مانیں گے۔وہ لوگ آپ کو غلط سمجھتے ہیں۔پہلی شادی کی ناکامی کے لیے سب آپ ہی کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔میں نے بھی اب جانا ہے آپ کو۔ورنہ یہاں جوائن (join) کرنے سے پیشتر ہمارے جاننے والوں نے عجب انداز میں خبردار کرایا تھا ہمیں۔''

''کیا کہا تھا آپ کے جاننے والوں نے؟''شہیر نے برجستہ سوال کیا تھا۔

''یہی۔کہ آپ۔اچھے انسان نہیں ہیں۔آپ کے نزدیک عورت صرف جسمانی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔اور۔اور۔''

''اور؟''

''اور یہ کہ آپ گھر بسانا چاہتے ہی نہیں تھے کبھی۔''شمع نے جلدی سے کہا۔

''اگر وہ سب سچ ہوتا تو میں تم سے یہ باتیں کیوں کہتا۔''شہیر نے چہرے پر اداس سے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''پھر ہمارے آپ کے خاندان بھی الگ ہیں۔رشتوں کے معاملات میں اب بھی ہمارے ہاں کچھ ایسے سمجھوتے نہیں ہوا کرتے۔رشتے انہیں میں ہوتے ہیں جو ہمارے برابر کے ہوں،زمین دار، جاگیر دار، چک دار وغیرہ رہے ہوں۔''شمع نے ٹھہر ٹھہر کر بات پوری کی۔

''ارے۔چھوڑیئے نا۔''شہیر نے اپنا بیاں ہاتھ جھٹک کر کہا۔

''وہ وقت چلا گیا۔پھر آپ کے خاندان والوں نے اگر عقلمندی سے کام لیتے ہوئے

زمین کا بیشتر حصہ خود کاشت نہ دکھایا ہوتا تو آپ کے ہاتھ سے بھی خاسی زمینیں نکل جاتیں۔ خیراب کہاں وہ زمانہ، اب تو بس، ایک ہی صف میں کھڑے...... ہمارے پاس تو کوئی زمین جائداد نہ تھی۔ ہم نے پڑھا۔ اچھی نوکریاں کیں۔ اب آپ کے سامنے ہیں۔'' شہیر آخری جملہ ادا کر کے فخریہ انداز میں گردن تان کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''آپ کا مطلب ہے ہم لوگوں کے ہاں تعلیم نہیں ہے؟'' شمع نے چہرے پر مسکراہٹ سی بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں نہیں کیوں نہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ اب سر اڑا دینے والا زمانہ نہیں ہے۔ آپ بس ذرا سا اڑ جائیے کہ آپ ہم ہی سے شادی کریں گی اور پھر دیکھئے۔''

''یہ مشکل ہوگا۔ اپنی زبان سے اپنی شادی کے بارے میں کیسے میں ایسی بات کہہ دوں۔''

''اچھا آپ بس اتنا کیجئے گا کہ کسی اور رشتے کے لیے ہاں نہ کیجئے گا۔ ہم ایک ایسے آدمی کو بھیجواتے ہیں کہ بس آپ دیکھتی جائیں۔''

کسی طرح رشتہ طے ہو گیا۔

''منگنی، مبارک۔'' شہیر مسکرا کر بولا۔

''آپ کو بھی''۔ وہ شرما گئی۔

''ہم دونوں کو۔'' وہ دونوں ہنس دیئے اور میز کے اطراف بیٹھے آہستہ آہستہ کافی کے گھونٹ بھرتے رہے۔

''اب آپ خدارا لمبا چوڑا جہیز مت لے آئیے گا۔''

''جو گھر میں سب کو دیا گیا۔ ویسے ہی۔''

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' شہیر نے ہتھیلی سے ٹھہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کی بات

کاٹ کہا۔

''ہم اسے اپنی بے عزتی خیال کریں گے۔ ہمیں قطعی کچھ نہیں چاہئے۔ یہ آپ بھی گرہ میں باندھ لیجئے اور اپنے گھر والوں کو بھی بتا دیجئے گا۔''

شمع دلہن بنی زیورات سے لدی، ڈھیروں ارمان بغیر سامان لیے سسرال آ گئی۔

اس دن سسرال میں اس کا تیسرا دن تھا۔ شب کے پہلے پہر کا کوئی وقت تھا۔

وہ...... اپنے آپ کو بھاری زیورات سے آزار کر رہی تھی۔

شمع نے اندر داخل ہوتے ہوئے شوہر کے عکس کو آئینے میں دیکھ کر کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ ''انہیں مجھ سے کیا مطلب۔'' وہ جیسے کہ اپنے آپ سے بولی تھی۔

''ٹھیک ہی تو کہا۔ ہمارے گھر میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اُس نے سنا کہہ دیا۔'' وہ مسہری پر دراز ہو گیا۔

''کیا مطلب۔'' شمع یکلخت شوہر کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی ''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''یونی...... یعنی، آپ نے خود ہی تو۔'' شمع کی آواز کپکپانے لگی۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ اسے اپنی سماعت پر اعتبار کرنا مشکل ہو گیا۔

''یہ۔ نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ بھی۔ یہ کیسے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔''

اس کے لیے سوچنا تک کٹھن ہو گیا۔ اسکی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ وہ اٹھ کر مسہری تک گئی اور یقین اور بے یقینی کے عالم میں شہیر کو دیکھنے لگی۔ شہیر نے بازو اس طرح ماتھے پر رکھا ہوا تھا کہ اس کی کہنی سے کلائی تک کا حصہ اس کے آدھے ماتھے، ابروؤں اور آدھی آنکھوں کو چھپا رہا تھا۔ بازو کے نیچے سے اس کی آنکھیں بدن معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ بات شمع کو بہت دن بعد معلوم ہوئی کہ شہیر کچھ اس طرح آنکھیں میچ لیتا کہ پلکوں کے عقب سے صاف دیکھا کرتا۔

شمع نے شہیر کو ایسے سوتے بنے دیکھا تو بتی گل کر کے لیٹ گئی۔

جانے کتنے گھنٹے وہ نہ جانے کیا سوچ کر روتی رہی۔ شہیر کروٹ بدل کر سو چکا تھا۔ سحر کے وقت کہیں شمع کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جب شمع بیدار ہوئی تو شہیر دفتر کے لیے نکل چکا تھا۔ دن جیسے تیسے کٹ گیا تھا اور اب شام ڈھلے بھی کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ شہیر واپس نہیں آیا۔ کوئی فون بھی نہیں کیا اس نے۔ وہ بے چین ہو کر سوچنے لگی۔ پھر برآمدے میں آ گئی اور نظریں گیٹ پر لگا دیں۔ کبھی چلنے لگتی، کبھی ٹھہر جاتی۔ اس کی خیریت کی دعائیں مانگتی ہوئی وہ برآمدے اور زینے کے درمیانی ستون سے لگ گئی۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ ہوا میں فرحت بخش سی خنکی تھی۔ اس نے اپنا گرم گرم رخسار ٹھنڈے سے سیمنٹ کے ستون سے لگا دیا۔ اس کے سینے سے ایک سلگتی ہوئی آہ نکلی اور کافی دیر سے ٹھہرا ہوا ایک آنسو آنکھ کے اندرونی کونے سے نکل کر لڑھکتا ہوا ناک کو بھگوتا ہوا اس کے بالائی لب پر آ ٹکا۔ عقب سے دروازہ وا ہونے کی آواز آئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''تم کھانا کھا لیتیں۔'' اس کی ساس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کی دونوں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

'ارے نادان ہو تم۔ ابھی اا جائے گا گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں اور بالکل ٹھیک ہوگا۔ آ جاؤ تم کھانا کھا لو۔'' اس کی ساس اندر کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔ اب سے ڈیڑھ گھنٹے بعد۔ یعنی ساڑھ گیارہ بجے۔ اور امی کو معلوم بھی ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ کہاں گئے ہیں۔ وہ اور جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

اس کے پاؤں وہیں منجمد ہو گئے۔

ڈیڑھ گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزرا کہ شہیر کی گاڑی کے ہارن کی آواز کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بھاگ کر گیٹ کھولنے گئی۔ گاری پہلے دائیں اور پھر بائیں طرف سے پھاٹک کی دیواروں کے ساتھ رگڑ کھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ شمع حیرت زدہ دیکھتی رہ گئی۔ یہ آج گاڑی

کیسے چلا رہے ہیں۔

وہ سوچنے لگی۔ مگر جب شہیرؔ گاڑی سے اترا تو خود بھی دائیں بائیں ڈولتا ہوا غیر متوازن چل رہا تھا۔

''کیا ہوا...... ؟'' وہ تشویش ناک آواز میں بولی۔ اور دھڑکتے دل میں ہر طرف سے آتے ہوئے غیر مبہم خیالات میں گھری اس کی طرف لپکی تو بدبو کا ایک بھبھکا اس کی شامہ سے ٹکرایا۔ دل کی دھڑکن پل بھر کو ساکت سی ہوگئی اور وہ خود بھی کچھ دیر کے لیے بے جان مجسمہ کی طرح بے حس وحرکت، لڑکھڑا کر چلتے ہوئے شوہر کو اندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے دماغ میں ریت سی اڑنے لگی۔ بے شمار رنگوں کے بے شمار ذرات۔ کوئی سرخ کوئی ہرا کوئی نیلا کوئی نارنجی اور کوئی سیاہ اور نہ جانے کون کون سا۔ اور آخر اس طوفانی ریت نے اس کی تصور کی بینائی کو اتنا دھندلا دیا کہ وہ کچھ دیکھ نہ سکی۔ پھر کچھ دیکھ نہ سکنے کے بعد وہ کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھی اور لڑکھڑاتے ہوئے شوہر کا بازو تھام لیا۔

زندگی رینگنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وقت اژدہا بن کر اُس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا ہے۔

پھر ایک دن ٹیلیفون پر کسی نے اسے کہا تھا کہ آپ کی گرہستی خطرے میں ہے۔ آپ خود معلوم کر لیجئے۔ میں ایک خیر خواہ ہوں...... فون بند ہو گیا۔

شمع نے ذرا سی کوشش کی تو بات واضح ہوگئی کہ شہیر آجکل اکثر ہی کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ اُسے خود کسی ایک آدھ تقریب کے علاوہ شہیر کے ساتھ کہیں جانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کی رات نشے کی نذر ہو جاتی۔ صبح وہ جلدی آفس چلا جاتا، یا جانے کہاں۔ شہیر اپنا سارا وقت اپنی مرضی سے گزارتا۔ اس میں وہ وقت بھی شامل ہوتا جو شمع کے ساتھ گزرتا۔

شمع کا رشتہ آنسوؤں سے جڑ گیا اور خدا کے حضور شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔ حالات کا یہ

کڑوا زہر وہ اکیلے کیسے پی جاتی اسے کسی کا سہارا تو چاہئے تھا۔ وہ دن بھر شام کے انتظار میں بجھی بجھی رہتی۔ شام میں سلگنے لگتی اور شب بھر قطرہ قطرہ آنسو بن کر بہتی رہتی۔ اسے اس گھر سے، اس کی مکینوں سے، زندگی سے، نفرت سی ہوگئی تھی۔ اس پر اس کی منی سی بیٹی کی زندگی کا انحصار نہ ہوتا تو شاید کچھ کر بیٹھتی۔

وقت ہوا کی زد میں آئی کتاب کے پنوں کی طرح پلٹتا گیا۔

شمع کی نند بیاہی گئی۔ دیور دُور دیس چلا گیا۔ ساس اللہ کو پیاری ہوگئی، پھر سسر بھی۔ شمع کی زندگی اولاد کی محبت کے سہارے کٹ رہی تھی مگر اسے سکون میسر نہیں تھا۔

مگر ادھر اس کی زندگی میں ایک عجیب موڑ آ گیا۔ اس کی محبت میں ایک اور محبت کا اضافہ ہو گیا۔ وہ بات اس کے قلب رنجیدہ کے زخموں پر مرہم ثابت ہوئی۔ ایسا مرہم کہ نہ کہیں درد رہا نہ اس کا احساس۔ رفتہ رفتہ اس کے اشک ٹھہر گئے۔ سکون لوٹ آیا۔ وہ اس محبت سے اس قدر خوش اور مطمئن تھی کہ اس نے شہیر کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

وہ بیوی ہونے کے سارے تقاضے پورے کرتی، گرہستی کا ہر کام خوش اسلوبی سے نبھاتی۔ مگر جب بھی اسے کچھ وقت ملتا وہ اپنے محبوب سے ملنے چلی جاتی۔ اب ایک عرصے سے اس نے شہیر سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

گو کہ شہیر اس کے کبھی کبھار پوچھے گئے سوالات کا جواب طعن وطنز سے دیتا تھا۔ اس نے کبھی اسے مطمئن جواب دینے کی کوشش تک نہیں کی تھی یا شاید اس کے پاس اس کے لیے جواب ہی نہ تھا، مگر پھر بھی شمع کے سوالات اس کے ذہن میں گونجا کرتے تھے۔ کسی کسی وقت وہ ان پر سوچتا بھی تھا۔

ادھر شہیر اس کے بدلے ہوئے رویے سے بہت خوش تھا۔ اب نہ کوئی تقاضا نہ کوئی سوال۔ وقت اس کے لیے اور زیادہ سہل ہو گیا۔ مگر مسلسل عیاشیوں سے اس کی صحت خراب ہونے لگی تھی۔ چہرے کی رونق ختم ہوا چاہتی تھی۔ اور وہ اپنی عادتیں بدلنے سے معذور تھا۔

پہلے تو شمع برسوں مستقل طور پر رنج وغم سے دوچار رہنے کی وجہ سے کمزور ہوگئی تھی۔ نہ تو شہیر کے پاس اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے وقت بچتا تھا نہ ہی وہ سجتی سنورتی تھی۔ اپنے وجود تک سے بے پرواہ ہوگئی تھی۔ مگر اب اس نئی چاہت سے اس کے چہرے کا مرجھایا پھول نہ صرف کھل اٹھا تھا بلکہ اس پر عجیب طرح کی چمک بھی آگئی تھی۔ یہ تبدیلی نادانستہ طور پر رفتہ رفتہ ہوئی تھی۔ شمع کو خود بھی اس بات کا کوئی احساس نہ تھا۔ ایک دن شہیر نے ہی یہ بات اچانک دریافت کی تھی۔

صبح کے تین بجے تھے۔ نشہ ٹوٹنے کے ساتھ اس کی نیند بھی ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ کے بھنور بنا بنا کر اڑانے کے بعد پھر بستر پر دراز ہوگیا اور بے مطلب کروٹیں بدلتا رہا۔ اسکی اس حرکت کی وجہ سے ہمیشہ شمع کی نیند کھل جاتی تھی اور پہلے کئی برس وہ اُس بات پر کڑھتی اور پریشان ہوتی تھی۔ اور شہیر بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بدکلامی شروع کردیتا تھا۔ مارے کوفت کے اگر شمع کے ہونٹوں سے آہ بھی نکل جاتی تو وہ اس موقعے کو جانے نہ دیتا۔ دوبارہ سونے سے پہلے زہر آلود لہجے میں دو چار کڑوے کسیلے جملے کہنا نہ بھولتا۔

''نیند میں مخل ہورہے ہیں ہم شہزادی عالم؟۔ زمین داریاں تو ختم ہوگئیں۔ مگر یہ آرام طلبیاں نہ گئیں۔'' وہ جملہ مکمل کر کے ایک کھوکھلا قہقہہ لگاتا۔

''مائیکے سے دو چار باندیاں لے آتیں تو اس وقت محترمہ کو ہاتھوں میں اٹھا کر دوسرے کمرے میں مسہری پر لٹا آتیں۔'' وہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر کھانسنے لگتا۔ شمع نے کبھی اس طرح کی کوئی بات ہی کی تھی نہ ایسا جتانے کی کوشش کی تھی۔

خدا جانے کیا بات ہے شہیر کے اندر جو اس سے اس طرح کے طنزیہ جملے کہلواتی ہے اُس سے۔ شمع سوچا کرتی۔

ادھر کچھ دو تین برس سے جوں ہی شہیر کے کروٹیں بدلنے اور سگریٹ کی کثافت سے شمع کی آنکھ کھلتی، وہ فوراً بستر چھوڑ کر بٹیا کے کمرے میں چلی جاتی۔ شہیر نے کبھی خیال نہ کیا کہ شمع

وہاں جا کر سوتی بھی تھی یا نہیں۔ وہ یہ بات بھی کہاں جانتا تھا کہ شمع کا اپنے محبوب سے ملاقات کرنے کا یہ بھی ایک وقت تھا۔

اس دن کوئی تعطیل تھی۔ جمعہ کا دن تھا اور اگلے دو دن بھی چھٹی کے تھے شہیر کا دوستوں کے ساتھ کہیں باہر جانے کا پروگرام تھا۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب شہیر بیدار ہوا تو اس نے شمع کو کہیں جانے کے لئے تیار پایا۔ شمع نے سیاہ رنگ کا قمیض سلوار پہن رکھا تھا۔ پیروں میں چھوٹی چھوٹی ایڑھیوں والے سیاہ سینڈل جو سامنے سے جوتے کی طرح بند تو تھے مگر انگلیوں کی جگہ سے کھلے تھے۔ کھلے پائنچوں کی سیاہ سلوار کے نیچے اس کے پاؤں کانچ کے شفاف ٹکڑوں سے نظر آرہے تھے۔ قمیض کی آستینیں کلائیوں کو ڈھک رہی تھیں۔ ہاتھوں اور پیروں کے صفائی سے تراشے گئے ناخنوں کے قریب سے انگلیوں کے گلابی پور گلاب کی کلیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ اس کے شانوں پر دبیز جار جیٹ کا چوڑا سا چادر نما سفید دوپٹہ لہرارہا تھا آنکھوں میں سرمے کی پتلی سی لکیر تھی بالوں کو اُس نے کسی ہوئی چوٹی کی شکل میں گوندر کھا تھا جو کمر سے نیچے تک جارہی تھی۔

پتہ نہیں شمع کے بال اتنے لمبے کب ہوگئے تھے۔ اور سیاہ دائروں میں پھنسی دھنسی آنکھیں بہت پہلے کی طرح گہری گہری سی کب لگنے لگی تھی۔ پہلے وہ ناخن تھوڑے بڑھا کر ان پر پالش لگایا کرتی تھی۔ پتہ نہیں اس نے انہیں تراشنا کب شروع کر دیا تھا۔ اس کی جلد کا رنگ بھی شادی سے پہلے کی طرح سنہری مائل گلابی ہو گیا تھا۔

شہیر دو سرہانوں کو اوپر نیچے رکھ کر ان پر کہنی لگا کر مسہری پر نیم دراز سگریٹ کے دھوئیں سے دائرے بناتا ہوا شمع کو دیکھتا رہ گیا۔ اسکے سامنے سادہ سے ملکوتی حسن کا ایک شاہکار تھا، جس کے پاس سے نور کی سعی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

''بچی سو رہی ہے آپ کے پیچھے۔ اس طرح کمرے کو دھوئیں سے آلودہ تو نہ کریں''۔ شمع نہ شہیر کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''تم کہاں جارہی ہو بچی کو چھوڑ کر۔ایسی ہی فکر ہے تو ساتھ لے جاؤ۔''

''میں ذرا باہر جارہی ہوں۔ جاگ رہی ہوتی تو ساتھ لے جاتی۔ پھر آپ تو آج یہی ہیں۔''

''کہاں جارہی ہو۔تم ؟اس کی آواز اونچی تھی۔

''کام ہے کچھ۔ایک دو گھنٹے میں لوٹ آوں گی۔''

''دو گھنٹے میں۔کیا ہمیشہ ایسے ہی جاتی ہو۔کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ۔''شہیر غصے سے پھنکنے لگا۔

''تو تم اپنی بھولی بسری زمیندارانہ عیاشیوں پر اتر آئیں۔'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

اسے یقین تھا کہ شمع کہے گی کہ اسے آج ہی فلاں کام پڑ گیا ورنہ وہ کہیں جاتی ہے۔مگر شمع اس کے اس انداز سے حیرت زدہ تھی۔شہیر میں تمام برائیاں سہی مگر اس نے آج تک شمع کے کردار پر کبھی انگشت نمائی نہیں کی تھی۔شمع کا دل بیٹھ سا گیا۔

انہیں مجھ پر شک ہو گیا ہے۔آج تک تو کبھی مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔انہوں نے۔آج انہیں مجھ سے بات کرنے کا وقت مل گیا۔یعنی مجھ سے سوال کرنے کے لیے وقت ہے ان کے پاس۔وہ سوچنے لگی۔اس کے دل و دماغ میں غصے کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔

''ہاں اکثر جاتی ہوں۔'' وہ دوپٹہ سنوارتے ہوئے بظاہر سکون سے بولی'' اور آپ آہستہ بولیے۔اس کی نیند خراب کر رہے ہیں آپ۔''

''نہیں مجھے بتاؤ تم کہاں جاتی ہو۔جاتی کہاں ہو تم''۔وہ بستر پر اُٹھ بیٹھا اور گرج کر بولا۔

مُنّی نے مُنّی مُنّی آنکھیں کھولیں۔اور ننھی سی ناک اوپر کو سکیڑ کر دائیں بائیں دیکھا۔پھر دونوں ہونٹوں کو جوڑ کر نچلا ہونٹ آگے کو نکال کر چند سکنڈ کے لیے منہ بسورا اور پھر چھوٹا سا

دہانہ پورا کھول کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ شمع نے ایک عجیب سی نظر جس میں غصہ تھا نہ شکوہ یا شاید کوئی اور تاثر۔ شہیر کے چہرے کی طرف ڈالی پھر اس کے آلتی پالتی میں مڑے ہوئے گھٹنوں کی طرف دیکھا اور مُنّی کو بانہوں میں لے لیا۔

''کھانا ہاٹ کیس میں ہے اور چائے تھرماس کیٹل میں۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھا ہے سب کچھ۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔''

وہ باہر کی طرف لپکی۔

''مُنّی کو کہاں لے جا رہی ہو؟'' شہیر اُچھل کر اس کے سامنے آ گیا۔

''ساتھ۔ میرے لوٹنے تک سوتی رہتی۔ جگا دیا۔ غریب کو۔''

''تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ۔ مُنی نہیں جائے گی۔'' وہ منی کو ایسے گود میں لینے لگا جیسے شمع سے اسے چھین رہا ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' شمع نے جلدی سے گرفت ڈھیلی کر دی۔ ''خدا حافظ'' وہ کمرے سے نکلتی ہوئی بولی اور شہیر ایک دم مسہری کی طرف 'مجھے تمہاری پرواہ نہیں' والے انداز میں پلٹا۔ شمع مسکراتی ہوئی باہر آ گئی۔

شاید اس لیے کہ اس طرح کا تصادم پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ شمع کس گنتی میں تھی کہ اس سے کچھ پوچھا جاتا۔ اسے تو بتایا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا۔ حکم دیا جاتا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی مسکراہٹ ایک مہین سی ہنسی میں بدل گئی۔

شمع کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں گئی۔ اور سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر شہیر منی کو گود میں لیے کھڑکی تک آیا۔ یہ بیگ ان دونوں نے ہنی مون سے لوٹتے ہوئے خریدا تھا۔

شمع بیگ میں کیا لے جا رہی ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔ شہیر دن بھر سوچتا رہا۔ شمع دو کی بجائے پانچ گھنٹے بعد لوٹی۔

وہ باہر کے دروازے میں چابی گھما کر اندر داخل ہوئی تو شہیر فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے شب خوابی کا لباس بھی نہیں بدلا تھا۔

''نہیں یار۔ آج کل نہیں آسکوں گا۔ پھر کبھی سہی۔''

وہ اکتائے ہوئے انداز میں عجلت، سے کہہ رہا تھا۔

''اچھا میں تھوڑی دیر میں بتاتا ہوں، بائے۔'' شمع پر نظر پڑتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ شاید مخاطب کا اسرار شدید تھا۔

''اتنی دیر کہاں لگائی تم نے۔'' اس نے قہر بھری نظروں سے شمع کی طرف دیکھا۔

''کام کچھ زیادہ نکل آیا تھا۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''اس بیگ میں کیا لے گئی تھیں۔'' وہ بیگ کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا

''کچھ سامان تھا۔ اسے کنگھال کر الگنی پر ڈال دو۔ ذرا صابن بھی لگا دینا۔'' شمع نے بیگ ملازمہ کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ اتنا خوبصورت بیگ۔ کس لاپرواہی سے میلا کر دیا تم نے۔''

شہیر شمع کا یہ بدلا ہوا رنگ دیکھ کر اپنی حیرت اور غصے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کسی جواب کی توقع میں شمع کی طرف دیکھ کر بولا مگر شمع نے کوئی جواب نہ دیا اور کپڑے بدلنے کے لیے اندر کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر بعد شہیر کے دوست کا فون آیا۔ کچھ دیر بحث ہوتی رہی پھر فون بند کر کے شہیر نہانے چلا گیا۔

''میں اتوار کی شام باہر رہوں گا۔ تم ان دنوں گھر سے باہر مت جانا۔ مجھے ملازم لوگوں پر بھروسہ نہیں ہے۔ شہیر کچھ تحکمانہ سنی آواز میں شمع سے مخاطب ہوا۔ مگر اس کا چہرہ اس کی تشویش کی صفا چغلی کھا رہا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر شمع دل میں دبی ہوئی جانے کون سی خوشی کو بمشکل تمام قابو میں رکھ

سکی۔ مگر شہیر اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے بغاوت کرتی ہوئی مسکراہٹ کو بھانپ گیا اور یکلخت پلٹ کر باہر نکل گیا۔ شمع کواڑ کی طرف دیکھتی رہی، جس کے اوپر ایک خوبصورت فریم کے اندر عربی میں ایک عبارت تحریری تھی۔

ان اللّٰہ مع الصابرین.

خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وہ مسکراتی ہوئی مُنی کے قریب گئی اور اسے باہوں میں لے کر اس کے نرم بالوں سے اپنا رخسار لگا کر جانے کہاں دیکھنے لگی۔

دوسرے روز ہفتہ تھا۔ شہیر کو اتوار کو آنا تھا۔ مگر شہیر اچانک ہفتے کی دوپہر آ گیا۔ اس نے دروازے کی گھنٹی پر کچھ اس طرح انگلی رکھ دی کہ گھنٹی مسلسل بجتی چلی گئی۔ شمع ہڑبڑا کر دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازہ وا ہوتے ہی شہیر، شمع کو تقریباً دھکا دے کر سامنے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے اندر کی طرف بڑھا اور گھر کے تمام کمروں میں یکے بعد دیگرے گھس کر ایک ایک گوشے میں نظریں دوڑا کر واپس نشست گاہ میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''صبح کہاں گئیں تھیں؟'' وہ تیز نظروں سے بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کہیں نہیں''، شمع آہستہ سے بولی۔

''جھوٹ بول رہی ہو تم۔'' وہ زور سے چلایا۔

''صاف صاف بتاؤ۔ جو بھی ہے کہہ دو۔ میں ناراض ہوں گا۔'' جملے کا آخری حصہ مکمل کرتے ہوئے اس نے آواز دھیمی کر لی تھی۔

''چلو بتاؤ۔'' وہ غصہ ظاہر نہ ہونے دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اور شمع جو لمحہ بھر پہلے اپنے اندر غم و غصے کی تلاطم کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تھرتھرا رہی تھی، یکسر سوچنے لگی کہ وہ شہیر کو وہ سب بتا دے جو وہ جاننا چاہتا ہے۔ مگر۔ کیوں بتائے۔ یعنی اپنی صفائی پیش کرے؟ اس انسان کو جو...... جو...... جو ساری زندگی...... وہ سوچتی رہی۔ لیکن گھر کے سکون

کی خاطر شہیر کا سب کچھ جان لینا ضروری ہے نہیں گھر میں ایسا کون سا سکون ہے۔کم سے کم یہ ہنگامہ تو پھر نہیں ہوگا۔سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ بتا دینا ہی بہتر ہوگا۔وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شہیر دھاڑا۔

''بولو۔ ورنہ۔ ورنہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔'' وہ دانت پیستا ہوا بولا۔اس کی یہ بات سن کر شمع کے تن بدن میں شعلے سے لپکنے لگے۔اس نے ایک زوردا قہقہہ لگایا۔اتنا زوردار کہ وہ اپنی آواز خود ہی پہچان نہیں پائی۔اور پیر پٹختی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ہفتے سے بدھ کے روز تک گھر میں تناؤ رہا۔شمع پرسکون تھی۔شہیر شدید ذہنی پریشانی سے دوچار تھا۔دفتر میں بھی اس کا دھیان گھر کی طرف رہتا۔وہ اکثر گھر کے ٹیلی فون نمبر پر انگلی رکھ دیتا۔اور شمع کی ''ہیلو'' سن کر بغیر کسی گفتگو کے سلسلہ ختم کر دیتا۔

ان دنوں شہیر کی مے نوشی شدت پکڑ چکی تھی۔

''آج کل تم سے کوئی کام ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہا۔تمہارا گھر میں دھیان ہوتا تو نا۔ بد سلیقہ عورت۔''

ایک رات بارہ بجے کے قریب اس نے سوئی ہوئی شمع کے قریب کھڑے ہو کر ایسی اونچی آواز میں کہا کہ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔کچھ دیر کے لیے وہ بات ہی نہ کر پائی۔

''کک....... کیا ہوا؟'' اس نے رُک رُک کر جلدی سے کہنے کی کوشش کی۔

''تم جانتی ہو کہ کبھی کبھی میں نمک زیادہ لینا چاہتا ہوں۔کھانے کے پاس تم نے نمک کیوں نہیں رکھا تھا۔'' وہ لڑکھڑاتی سی آواز میں بولا۔

''وہیں تو ہے ڈائننگ ٹیبل پر۔ بالکل درمیان میں۔ پھول دان کے پاس۔'' شمع نے نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مگر اس کونے کے قریب کیوں نہیں رکھا تھا جہاں ہاٹ کیس اور پلیٹ رکھی تھی۔'' اس

نے جھولتا ہوا ہاتھ نچانے کی کوشش کی۔

''آپ اٹھا لیتے برابر سے۔''

''اٹھا لیتا۔ بے حیا۔ یہ کس نے تمہیں ہمت دی ہے جواب دینے کی۔ کس کی شے پر بولتی ہو حرافہ....... کون ہے وہ حرام....... کیا خاص بات ہے اس میں۔'' یہ بات کہتے کہتے شہیر آئینے کے سامنے چلا گیا اور خود کو آئینے میں بغور دیکھتے ہوئے اپنی ٹائی ڈھیلی کرنے لگا۔ شمع ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔

شہیر کی بدکلامی شمع کے لیے نئی نہ تھی۔ مگر یہ باتیں گھر میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔ شمع کو حالات کے اس سطح پر آجانے کا رنج ہو رہا تھا لیکن کہیں کہیں سے شاید وہ خوش بھی تھی کہ اس نے برسوں رو رو کر رشتے اور وفا کی دہائی دے کر شہیر سے کئی سوال کیے تھے مگر شہیر نے کبھی جواب تک دینے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اور اب اس کو اس بے چارگی سے سوال کرتا دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خدا شہیر سے اس پر ڈھائے مظالم کا اسی طرح بدلہ لے رہا ہے۔ اس نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا اور اندر جا کر نمک دانی ہاٹ کیس کے پاس رکھ دی اور منی کے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

شمع سوئی ہوئی مُنی کے قریب لیٹ گئی۔ اس نے دو ایک گہری سانسیں لیں اور چھت کو دیکھنے لگی۔ دو آنسو اس کی آنکھوں کے بیرونی گوشوں سے نکل کر ڈھلکتے ہوئے اس کے کانوں کے پاس سے ہوتے ہوئے بالوں کو تر کر کے سرہانے میں جذب ہو گئے۔

اگلے دن جمعرات تھی۔ شہیر دیر تک سوتا رہا۔ جب جاگا تو اس نے شمع کو باورچی خانے میں مصروف پایا۔ لذیذ پکوان کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ شمع نے ضرور کسی کو دوپہر کے کھانے کے لیے مدعو کیا ہے۔ اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی وہ آجائے گا۔

''آپ گھر میں ہیں۔ آج؟'' شمع نے چائے کمرے میں پہنچائی۔

''کیوں میرے یہاں رہنے سے تمہارے پروگرام میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے؟''

''نہیں۔ دراصل میں کہیں جارہی تھی۔'' وہ بے تاثر آواز میں بولی۔

''اوہ! تو مجھے گھر میں دیکھ کر تم نے ارادہ بدل دیا ہے۔'' شہیر اس کی آنکھوں میں مسلسل دیکھتے ہوئے بولا۔ شمع کے دل میں نفرت کی لہر سی اُٹھی۔ اس نے منھ دوسری طرف موڑ دیا۔

''اچھا تو اب۔ تم میری نظروں کا سامنا بھی نہیں کرسکتیں۔'' شہیر نے دوسری طرف لگے آئینے میں شمع کی شبیہہ سے کہا۔ اور اُٹھ کر اس کے پاس آگیا۔

شمع نے بھورے رنگ کی لمبی سی قوسیہ دامن والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اسی رنگ کا چوڑی دار پائجامہ اور چوڑی سی اوڑھنی، پیروں میں سیاہ جوتیاں تھیں۔ سر جھٹکے سے دوسری طرف موڑنے سے اس کی لمبی گھنی چوٹی پلٹ کر سامنے آگئی تھی۔ اور گلے کے پاس سے ہوتی ہوئی گھٹنوں کو چھو رہی تھی۔ اس کی گردن اور چہرہ اس لباس میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے پتھروں کے درمیان سے سورج کی کرنوں کو منعکس کرتی ہوئی کوئی ندی بہہ رہی ہو۔ اس کے عکس کے ساتھ شہیر کا اپنا عکس بھی آئینے میں شامل ہوگیا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اس کے چہرے پر رات بھر کی اُگی ہوئی داڑھی میں کئی بال سفید تھے۔ شاید سگریٹ کی زیادتی سے...... بلانوشی کے بعد بسیار خوری سے چہرے اور بدن کی ضرورت سے زیادہ چربی جلد کی رنگت کو پیلاہٹ میں بدل چکی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے چربی کی موٹی سی تہہ ایک اور چوڑی سی ٹھوڑی بنا رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے کی کھال پانی کے بلبلوں کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں کچھ سرخی سی کچھ زردی سی تھی۔ چہرے پر بیماروں کی سی تھکن کے آثار تھے۔

شہیر اپنے اور اس کے عکس کو دیکھتا رہ گیا۔ شمع نے اس کی طرف ترس کھانے والی نظروں سے دیکھا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

کچھ وقفے سے وہ بڑا سا سیاہ بیگ لیے باہر جارہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ گلی کے موڑ کے پاس پہنچ کر اس نے رکشے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دور سے اسے شہیر

اپنے تعاقب میں آتا دکھائی دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ منی کو گھر میں تنہا چھوڑ آیا ہے۔ شمع نے تڑپ کر سوچا۔ وہ دوسری گلی سے واپس گھر کی طرف مڑ گئی۔ چابی دونوں کے پاس رہتی تھی۔ اس نے منی کو ساتھ لیا اور گھر سے نکل گئی۔

شمع لڑکپن سے ہی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔ شادی کے بعد اس کا آنسوؤں کا اور نماز کا ایک گہرا اور مضبوط رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ مگر رنج والم سہنے کی اس میں طاقت نہ تھی بس ایک اتفاق نے اسے یہ راستہ دکھا دیا۔ اور زندگی کا مفہوم دوسرا ہو گیا۔

وہ ایک بیمار سی شام تھی۔ پیلے پیلے بادلوں نے آسمان کو ایک میلی سی اوڑھنی اوڑھا دی تھی۔ شمع نہایت اداسی اور بے چارگی کے عالم میں، گھر سے کچھ دوری پر واقع خواجہ کی درگاہ پر آ گئی تھی۔ جب ہی اس کے تڑپتے دل کو ایسا سکون ملا کہ وہ ہر جمعرات کو ظہر کی نماز وہیں ادا کرتی۔ خواجہ کے دربار میں۔

خواجہ کے فقراء کے لیے کبھی کھانا کبھی کھیر یا کبھی حلوہ بنا کر لے جاتی۔ کسی کونے میں بیٹھ کر قوالی سنتی۔ اور سنتے سنتے جانے کہاں پہنچ جاتی۔ کسی ایسے مقام پر جہاں سے لوٹ کر آنے کو اس کا جی نہ چاہتا۔ اس کا جی یہی چاہتا کہ یہ ماحول قائم رہے اور وہ اپنی ساری حیات جی لے۔ خواجہ کا دامن ہاتھ میں کیا آیا کہ اسے جینے کا مقصد مل گیا۔ خواجہ کی لگن نے اس میں زندہ رہنے کا حوصلہ بھر دیا۔ وہ خواجہ کے مساکین اور اپاہجوں کی غمگسار سی بن گئی تھی۔ پہلے وہ تھی اور اس کی محرومیوں کا غم، اب میں خواجہ کے سوالی اور اس کا عشق بھی شامل ہو گیا تھا۔

شہیر نے جب اسے گلی سے مڑتے ہوئے دیکھا تو رفتار تیز کر لی۔ بلکہ ایک رکشہ بھی لے لیا مگر نکڑ کی دوسری طرف کی گلی میں وہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ واپس گھر گیا تو منی بھی نہ تھی۔

شمع جب درگاہ پہنچی تو ظہر کی نماز کے لیے صفیں بندھ چکی تھیں۔ اور وہ خواتین کے لیے

بنی عبادت گاہ میں داخل ہوگئی۔

صحن میں قوالوں نے سُر درست کیے اور ہارمونیم پر ایک پُر سوز سی دھن چھیڑنے کے ساتھ ساتھ ایک منقبت شروع کی۔

نمائندہ قوال نے رِشب سے شروع کر کے ایک خوبصورت سا الاپ دیا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے آ کے آس پاس بیٹھنے لگے۔ شمع دعا مانگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر منی کے پاس آ گئی۔ اور بیگ میں رکھا پکوان خیرات کی پیٹی کے پاس بیٹھے مجاور کے حوالے کیا تا کہ وہ اسے تقسیم کر کے کہ اس ہجوم میں ایسا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اس کے بعد وہ قوالی کے سامعین کے دائرے کی آخری قطار سے کچھ دور منی کو لیے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چادر نما دوپٹہ ایسے اوڑھ رکھا تھا کہ اسکے چہرے میں سے صرف اس کی دو آنکھیں اور رخسار کا ایک کونہ نظر آ رہا تھا۔

قوالی اپنے شباب پر تھی۔ ہارمونیم کے موسیقی کے ساتھ تالی کی تال اور طبلے کی تھاپ جیسے روح پر پڑتی معلوم ہو رہی تھی۔ قوالی راگ براندابنی سارنگ میں گائی جا رہی تھی۔ جو دوپہر کے وقت ہی گایا جاتا ہے۔

میرا پیا گھر ایا ہو لال نی　اللہ نے ملایا کمال نی
گھڑی گھڑی گھڑیال بجاوے　رین وصل دی پیا گھٹاوے
میری من دی بات نہ پاوے　وچھڑنا ہویا محال نی

شمع کا دل رقص کر رہا تھا۔ روح جیسے کہ عرش کے قریب ہی کہیں روشنیوں کے دوش پر تیر رہی تھی۔ وقت کے گزرنے کا کوئی احساس نہ تھا۔

پھر کسی وقت قوال نے منقبت ختم کی اور نعت شروع کی۔ دوپہر کے ہی ایک راگ بھیم پلاسی میں۔ کہتے ہیں۔ راگ اگر اپنے منتخب اوقات میں گائے بجائے جائیں تو انسان تو کیا

چرند و پرند بھی جھوم اٹھتے ہیں۔ مگر درگاہ میں وہ سماں تھا کہ اگر راگ کسی اور وقت کے بھی گائے جاتے تو کچھ فرق نہ پڑتا کہ ماحول Time اور Space کی بندشوں سے ماورا تھا۔ فضا میں اگربتی اور لوبان کی مہک رچی تھی۔ دربار خواجہ کا تھا اور ذکر دو جہاں کے بادشاہ کا تھا۔

تاجدار حرم ہو نگاہِ کرم ہم غریبوں کے دن کب سنور جائیں گے
والئی بیکساں کیا کہے گا جہاں آپ کے در سے خالی اگر جائیں گے

شمع کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ اپنی چادر کا کنارہ ناک کے اُوپر سے لاکر دانتوں میں دبائے دونوں ہاتھ چہرے پر دھرے وہ چپکے چپکے سسک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جسم اور روح دو الگ الگ چیزیں ہو کر رہ گئی ہوں۔ منی اس کے زانوں پر سر رکھے منھ میں انگوٹھا ڈالے سو رہی تھی اور خود شمع جانے کہاں تھی۔

قوالی ختم ہوئی تو وہ اچانک جیسے کہ ہوش میں آ گئی۔ موذن عصر کی اذان دینے والا تھا۔ اسنے چادر سے چہرہ پونچھا، آنکھیں خشک کی۔ مجاور جانے کب اس کا خالی بیگ اس کے پاس رکھ گیا تھا۔ اسنے بیگ تہہ کر دیا اور آہستگی کے ساتھ اسے منی کے سر کے نیچے رکھ کر خواتین کے لیے مخصوص، عبادت گاہ میں داخل ہوگئی۔

گھر لوٹتے وقت اس کا سر بھاری تھا، مگر دل تتلی کی طرح ہلکا۔

وہ نہایت پُرسکون سی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ خواجہ کے دربار کا سکون و سرور اس کے جسم پر حاوی اور روح میں حلول تھا۔ سماعت میں نغمے گونج رہے تھے۔ دماغ خوشبوؤں کے حصار میں تھا، دل پر عشق کا قبضہ تھا۔ جیسے وہ ہواؤں میں تحلیل ہو کر دور ریگستانوں کے اُس پار پہنچ گئی ہو۔ اور اس سرزمین کا جی بھر کے طواف کرنے کے بعد اب مطمئن لوٹی ہو۔ اس کے سارے دکھ ختم ہو گئے ہو۔ سارے غم ڈھل گئے ہوں اور کس معصوم بچے کی طرح اسے کوئی فکر و پریشانی نہ ہو۔

سوئی ہوئی منی اس کے شانے سے لگی تھی۔ اور سوجی ہوئی آنکھیں ابھی بھی پوری طرح وانہ تھیں۔ وہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی کہ ایک تیز دھما کہ ہوا۔ جیسے خاموش وادیوں میں کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔

''کہاں سے آ رہی ہو تم''، شمع نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا شہیر نشست گاہ کے درمیانی صوفے کے کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹی۔ وی کا ریموٹ کنٹرول تھا اور وی چینل پر نیم برہنہ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ اس نے ٹی وی کی آواز بند کر رکھی تھی۔

''کچھ کام۔ کام تھا مجھ کو۔''، شمع نے منی کو صوفے پر لٹا دیا۔

''بغیر بتائے منی کو مت لے جایا کرو تم۔ میری طرف سے۔ تم چاہے بھاڑ میں جاؤ۔'' وہ دانت پیستے ہوئے نتھنے پھلا کر بولا۔ شمع اب پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ اور پانی پینے لگی۔

''آخر تم جاتی کہاں ہو بتاؤ مجھے''۔ وہ دہاڑا۔ شمع نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کہاں سے آ رہی ہو تم۔ بتاؤ'' یہ جملہ سن کر شمع پانی کا گھونٹ منہ میں لیے نگلے بغیر شہیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس جملے میں ایک گلہ تھا۔ جو شمع نے پہلی بار محسوس کیا۔ ایک شکوہ تھا۔ جو آج تک شہیر کی آواز میں سنائی نہ دیا تھا۔ ایک شکست تھی۔ جس کا وہ کبھی عادی نہ تھا۔ اور ایک التجا تھی۔ جو برسوں پہلے اس کی باتوں میں ہوا کرتی تھی۔ جب وہ شمع کی معصومیت کو اچھا لگنے لگا تھا۔

شمع گلاس لبوں سے لگائے سوچتی رہ گئی کہ کیا وہ شہیر کی لاپرواہیاں بے وفائیاں اور بد زبانیاں معاف کر کے اسے شکوک کے سلگتے آتش فشاں سے کھینچ لے یا اس کی دی ہوئی الم زدہ تنہائیوں کے بدلے میں اسے بھی ساتھ رہ کر تنہائیاں سونپ دے۔ ❀❀❀

اُس بستی کی رات

نعیمہ مہجور

اُن دنوں میں بہت چھوٹا تھا جب داداجی میرا ہاتھ تھامے مجھے دور بہت دور پہاڑی کے دامن میں بل کھاتی ندی کے کنارے آباد اُس بستی میں لے جاتے جہاں اُن ہی کی طرح ایک عمر رسیدہ پیڑ پیار کا شامیانہ پھیلائے ہر آنے جانے والے کو مقدور کے مطابق پناہ دیتا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد ہر گُزرنے والا جاتے جاتے ایک بار ضرور اس پیڑ کی عمر کے بارے میں سوچتا جس نے اُس زمانے میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر چھاؤں کا اہتمام کیا تھا۔ ورنہ جہاں تک بھی نظر جاتی، بسیار پیڑ نظروں سے گُزرتے لیکن .... اس پیڑ کی خصوصیت ہی کچھ اور تھی۔ اس کی چھاؤں میں اپنائیت کا احساس تھا۔ ٹھنڈک کا کچھ اور ہی سامان پیدا کر رہا تھا بالکل اس بستی کے لوگوں کی طرح جو ہنگاموں سے دور قدرتی مناظر میں ڈوبے پہاڑی کے دامن میں زندگی کے دن گزارتے تھے۔ کسے فرصت تھی کہ وہ ایک دوسرے کا دکھڑا سُننے کے لئے بیٹھتا۔ ہر ایک حالات کا ے انگاروں پر چلتا تھا۔ کڑی دھوپ میں زندگی کی لمبی مسافت طے کرنے کے بعد راہ میں تھوڑی سی چھاؤں بھی گزرے، ستانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن فرصت ہی کہاں جو زندگی کے حالات کو ازسرِ نو تشکلیل دیتا۔ گزرے ایام کے تانے بانے بنتا، اور راہِ نجات حاصل کرتا۔ لیکن بے شمار تفکرات اور بے شمار غم ہونے کے باوجود ان کے سوکھے ہوئے ہونٹ مُسکان لئے ایک دوسرے کے درد کا مداوا بنتے ہیں۔ یہاں کی ہر آنکھ مُسکراہٹوں کا انبار لئے

ہر اجنبی کا سواگت کرتی۔ دُکھ سکھ میں اسی طرح ایک دوسرے کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ جس طرح پت جھڑ کے پتوں کی وہ بیل اُس برگزیدہ پیڑ کے گرد لپٹی ہوتی تھیں۔

سامنے ہی کنکروں کے ڈھیر سے میں نے چند کنکر اُٹھائے اور پانی کے بہاؤ پر مارتا گیا۔ ہلکا سا مدوجزر اُٹھ کر پھر ڈوب جاتا۔ اطراف واکناف میں جہاں تک بھی بازوؤں کو وسعت پھیل جاتی۔ میرے کنکر منتخب نشانوں تک پہنچ کر گر جاتے۔ اور پھر ایک دن جبکہ میں دنیا کے ہنگاموں سے دور نشانہ بازی میں کھویا تھا ایک طمانچہ میرے گال پر پڑا۔ مجھے ایسے لگا جیسے دور خلاؤں میں کسی نے میرے پر گوڑ ڈالے اور میں قلابازیاں کھاتا ہوا دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ غیر ارادی طور پر میرا پھینکا ہوا ایک پتھر داداجی کے گال پر لگ گیا تھا۔ نہ جانے اُن کے کتنے خواب ٹوٹ گئے تھے۔ ماضی کی کونسی لڑی کٹ گئی تھی۔ میں ڈر کے مارے ایک طرف سرک گیا۔ اور سہمی سہمی نظروں سے اُنہیں گھورنے لگا۔ جیسے جو کچھ بھی انہوں نے اس تھپڑ کی آڑ میں کہنا چاہا، سمجھ گیا تھا۔

شام کی ہلکی ہلکی سیاہی پھیلتے ہی بستی کے لوگ تلاش روزگار کے بعد اپنے ٹھکانوں پر آتے۔ دور دُور تک پگڈنڈی پر مدُھر گیتوں کی رسیلی تان کانوں میں رچ بس جاتی اور داداجی حسبِ معمول میرا ہاتھ تھامے ایک انجانی منزل کی طرف گامزن ہوتے۔

یہ تو ہمارا معمول تھا۔ کہتے ہیں عمر کے ساتھ ساتھ زندگی کی سرگرمیاں بھی کم ہوتی جاتی ہیں۔ اور پھر دھیرے دھیرے سارے رشتے یکسر کٹ جاتے ہیں______!

ایک دن اسی عمر رسیدہ پیڑ کی چھاؤں میں میرے داداجی کی چتا میں آگ لگادی گئی۔ بستی کی آنکھ نم تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد کسی حادثے کا شکار ہوا ہے۔ اُس شام کسی کے گھر چولہا نہیں جلا۔ سرِ شام ہی بستی کے لوگ دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے اور داداجی کی بھلائیوں کو گننے لگے۔

غموں اور حادثوں کا کیا____ برساتی پانی کی طرح آتے ہیں اور گھنے جنگلوں میں برس

کر چلے جاتے ہیں۔ زخم مندمل ہوتے ہیں لیکن اپنے پیچھے دائمی یاد کی شکل میں ایک نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ جو حادثوں کو بولنے نہیں دیتے۔ زندگی کے دن بھی ندی کی رفتار کی طرح بہنے لگے۔ یادوں کا ایک بے ہنگم کارواں میرے اور بوڑھے پیڑ کے گرد گھومتا۔ اور میں پریشان سا ہوکر بے شمار کنکر پانی کی سطح پر مارتا۔ میں اسکی روانی پر ایک بندھ باندھنا چاہتا تھا۔ تاکہ بستی کے لوگوں میں شانتی کی وہی فضا بکھیر دیتا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس گاؤں سے رخصت ہوتی جاتی تھی۔

کنڈکٹیر کی گرج دار آواز سے میں چونک گیا۔ چند لمحوں کیلئے میں اپنے وجود کو بھول گیا تھا۔ میرے کانوں میں عجیب سی گڑگڑاہٹ گونج رہی تھی۔ تاہم جوں جوں منزل قریب آئی مشینوں کی گھن گرج نے فضا کو جھنجھوڑ ڈالا۔ دل دہل سا گیا۔ ندی کے آس پاس اونچی فصیل تھی اور فصیل کے اندر دیوہیکل مشینوں کا جال بکھرا تھا۔ میں گیٹ کے قریب تھا۔ میری نظر غیر ارادی طور پر گیٹ کے ایک طرف اویزان بورڈ پر پڑی جس پر موٹے حروف میں لکھا تھا:

"RESEARCH PLANT OF ATOMIC ENERGY".

______ اور میں دم گھٹنے کا انتظار کر رہا تھا ______!

خیرات

زنفر کھوکھر

بڑی میڈم صاحبہ اوران کی ساتھی استانیاں اپنے آفس کے باہر برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھی، اپنے کسی آئندہ پروگرام کے بارے میں محوِ گفتگو تھیں اور وقفے وقفے سے اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کررہی تھیں۔

بڑی میڈم صاحبہ اپنے سر پہ سیاہ سکارف اوڑھے ایک بڑی کرسی پر جس کے سامنے ایک ٹیبل لگا تھا، بیٹھی تھیں جبکہ اُن کی ساتھی استانیاں سامنے لگی کرسیوں پر بیٹھی ہوئیں تھیں۔ محفل نہایت ہی خوشگوار ماحول میں جمی تھی۔ اسی دوران ایک دبلی پتلی سی عورت، پرانی اور میلی سی ساڑھی پہنے، بغل میں ایک کمزور اور مریل سا بچہ اٹھائے، ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور ہاتھ پھیلا کر کہا ''بہن جی! بھگوان کے نام پر کچھ دے دو........ ہم بھوکے ہیں........ ہمارا بچہ بھوکا ہے........''

چند استانیوں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ اپنے اپنے بیگوں اور پرسوں کی طرف بڑھا دیئے۔ لیکن بڑی میڈم صاحبہ مانگنے والی سے برہم سے لہجے میں بولیں، ''کیوں مانگتی ہو۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں نا تمہارے۔ کام کرو کام! مانگنے کی تم لوگوں کو عادت سی پڑ گئی ہے۔ جہاں دیکھو تم لوگ حاضر ہوتی ہو۔ بس منہ اٹھائے چلی آتی ہو مانگنے........'' یہ کہہ کر بڑی میڈم صاحبہ نے اپنی ساتھی استانیوں سے کہا، ''بھئی، مت دو اسے۔ یہ لوگ مانگ مانگ کر شراب پیتے ہیں۔ دیکھتی نہیں ہو، پُل کے آر پار یہ لوگ کیسے

بے سدھ پڑے ہوتے ہیں۔''

بڑی میڈم صاحبہ کے حکم کی تعمیل میں بیگ اور پرس کھولنے والیوں نے اپنے ہاتھ روک لئے اور مانگنے والی خالی ہاتھ لوٹ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور مانگنے والی آن پہنچی۔ اب ان مانگنے والوں کو کون روکے۔ ہسپتالوں، سکولوں، کالجوں، دفتروں اور دیگر اداروں میں بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر ان کے لئے آسانی یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی جگہ سے انہیں کچھ زیادہ مل جاتا ہے اور زیادہ بھاگ دوڑ کرنے سے بچ جاتے ہیں۔

اب مانگنے والا ایک ادھیڑ عمر سکھ تھا جو دھلے ہوئے مگر ادھ پرانے سے کپڑے اور بے رنگ سی پگڑی پہنے ہوئے تھا۔ استانیوں نے عین سامنے کھڑے ہو کر اس نے کہنا شروع کیا، ''میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی اور نہ ہی میرے خاندان میں کبھی کسی نے بھیک مانگی ہے۔ آگ کی ایک واردات میں میرا گھر اور سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ میں آپ سے صرف ایک بار کی مدد چاہتا ہوں۔''

پہلے کی طرح کچھ استانیوں نے اپنے ہاتھ اپنے اپنے بیگوں کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ بڑی میڈم مانگنے والے سے نہایت ہی سخت لہجے میں بولیں، ''ہاں ہاں! بہانوں کی کوئی کمی ہے کیا۔ مانگنے والوں کو مانگنے کے سو بہانے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی کیلیئے سیلاب آ جاتا ہے اور اس کا سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ تمہارے لئے آگ بھڑک اٹھی۔ تمہارا سب کچھ راکھ ہو گیا اور تم بچ گئے مانگنے کے لئے۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں نا، جاؤ کام کرو۔''

میڈم جی کا آخری جملہ ابھی مکمل ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ آدمی نظریں جھکا کر واپس بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی تیز رفتاری سے لگتا تھا کہ اب وہ کبھی کسی سے کوئی مدد طلب نہیں کرے گا۔

بڑی میڈم صاحبہ نے اپنے سٹاف کے ساتھ میٹنگ جاری رکھی اور اب کہ ان کی میٹنگ برخاست ہونے ہی والی تھی کہ ان کی نظریں دو عورتوں پر جا ٹھہریں۔ دونوں عورتیں مین گیٹ

سے اندر داخل ہوکر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی سیدھی اوپر والے برآمدے میں چلی گئیں۔ وہاں کچھ مرد لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں عورتیں برقعہ پوش تھیں۔ چہرے اگر چہ کھلے ہوئے تھے۔ ایک عورت جوان تھی جبکہ دوسری ادھیڑ عمر۔ جوان عمر عورت کے ہاتھ میں ایک لمبا سا کاغذ لہرا رہا تھا۔

میٹنگ میں بیٹھی استانیوں نے اپنے اپنے بیگ سنبھالتے ہوئے بڑی میڈم صاحبہ سے پوچھا "اب ہم چلیں نا۔" مگر بڑی میڈم صاحبہ نے جواب میں کہا "ٹھہرو، ایک منٹ کے لئے۔ پتہ لگنے دو یہ عورتیں کون ہیں اور کیا کہتی ہیں۔"

اگلے چند ہی منٹوں میں وہ دونوں عورتیں اپنے میلے کچیلے برقعے لہراتی ہوئی ان کے سامنے آن پہنچیں اور ہاتھ میں ایسا لمبا سا کاغذ آگے بڑھاتی ہوئی جوان عورت گویا ہوئی، "میڈم جی، یہ تصویر ہماری بڑی بہن کی ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے چھ بچے ہیں۔ یہ پہاڑی سے نیچے گری، اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہم ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے ٹانگ کاٹ ڈالی۔ اس کا خون ختم ہوگیا۔ اب پیسے نہیں ہیں۔ علاج کیسے کروائیں۔ دوائی مہنگی ہے۔ ڈاکٹر کی فیس بہت ہے۔ میڈم جی، ہماری مدد کرو۔" ساتھ والی ادھیڑ عمر عورت اس کی باتوں کی تائید کرتی گئی۔ بڑی میڈم صاحبہ نے فوراً کاغذ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اپنے ہاتھ میں لے کر اسے غور سے دیکھا۔ کاغذ پر ایک رنگین تصویر چسپاں تھی۔ نیچے کچھ لکھا تھا اور سٹیمپ بھی لگی تھی۔ میڈم صاحبہ نے پڑھا تو کچھ نہیں، البتہ تصویر کو غور سے دیکھا۔ تصویر میں ایک جوان عورت پر سکون انداز میں بیٹھی سامنے تک رہی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے کچھ اوپر سے کٹی ہوئی تھی اور اس پر تازہ تازہ خون دکھائی دے رہا تھا۔

بڑی میڈم نے خود دیکھ لینے کے بعد کاغذ اپنی ساتھی استانیوں کی طرف بڑھایا اور جلدی سے اپنا پرس کھولتے ہوئے ان سے کہا، "بھئی دے دو نہیں، جتنا بھی ہوسکتا ہے۔ بے چاری مصیبت میں پڑی ہیں!" آہ بھر کر آخری جملہ پورا کرتے ہوئے بڑی میڈم نے اپنے پرس

سے سو روپے کا نوٹ نکال کر داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں میں تھام لیا۔

باقی سب نے باری باری تصویر کو دیکھا اور سر اٹھا اٹھا کر سامنے کھڑی دو عورتوں کو دیکھا اور پھر اپنے اپنے بیگ اور پرس کھولنے اور ٹٹولنے لگیں۔ بڑی میڈم جی نے مزید کہا، ''ایسے کوئی تھوڑی ہی مانگتا ہے۔ مر کے مانگا جاتا ہے، مر کے!''

اب کے کسی میڈم نے، گن، گن کر سو روپے پورے کئے۔ کسی نے اسی روپے گئے۔ کسی نے ساٹھ اور کسی نے پچاس نکالے۔

ادھیڑ عمر عورت نے جھولی آگے پھیلائی اور استانیوں نے روپے اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔ بڑی میڈم جی نے آخر میں اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں تھامے سو کے نوٹ سے ہی اشارہ کر کے عورت کو اپنے قریب بلایا اور سو کا نوٹ اس کی جھولی میں ڈال کر پچاس کا نوٹ اٹھالیا۔

دونوں عورتیں خوشی خوشی اپنی اگلی منزل کی جانب چل پڑیں تھیں۔
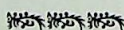
چوک

سر پر ہیٹ، آنکھوں پر سیاہ چشمہ، گھنی سیاہ مونچھیں، پُرکشش کلین شیو چہرہ، اُٹھی ہوئی گردن، دُور دُور تک جیسے کچھ تلاشتی ہوئی نظریں، ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ، گہرے نیلے رنگ کی جین کی پینٹ میں جکڑا ہوا موبائل اور ہاتھ میں یقینی طور پر چھوٹا سا کیمرا لئے، ایڑیاں جما جما کر قدرے تیز قدموں سے کچھ دوری سے آتے ہوئے اُس نوجوان پر اُس کی جو نظر پڑی تو وہ فوراً ہی چوکس ہوگئی۔ ایک خوشی لہر اُس کے وجود کو سیراب کر گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے آج اُس کی دیرینہ تلاش ختم ہوگئی ہو اور اُسے منزل مل گئی ہو۔

مگر اگلے ہی لمحے ایک خیال اُس کے وجود کو تھرا گیا۔ ''اللہ نہ کرے، یہ پُرکشش نوجوان کسی سے وابستہ ہو چکا ہو، یا پھر کیا معلوم کتنی ہی ناگنیں اسے ہتھیانے کے لئے اِس کے پیچھے پڑی ہوں۔'' وہ دِل ہی دِل میں بُڑ بُڑا اُٹھی۔ ''مگر نہیں! حُلیے مہرے سے ایسا نہیں لگتا ہے۔'' اُس نے اپنے خیال کی خود ہی تردید کر ڈالی۔

پہلی ہی نظر میں وہ اُس پر اس قدر لٹو ہوگئی کہ خوبصورت لڑکیاں اُسے ایک دم سے ناگنیں سی لگنے لگی تھیں۔ ''خیر جو بھی ہو، وہ اُس کا اتہ پتہ معلوم کرے گی اور اُسے پانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔'' خود کو فوری طور پر دُھارس بندھاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کا پیچھا کرنے کے لئے۔ ''وہ جہاں جہاں جائے گا، وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلی جائے گی۔ اُسے کسی نہ کسی بہانے سے مخاطب کرے گی۔ اُس کا اتہ پتہ معلوم کرے گی۔ وہ

اس کے ساتھ ڈھکا چھپا انداز ہر گز نہیں اپنائے گی بلکہ سیدھے سیدھے اپنا مطلب اور مقصد اُس پر واضح کرنے لگی اور اسے اپنی غرض وغایت سے آگاہ کرے گی۔ چونکہ آج کے وقت کا تقاضا ہی یہی ہے کہ آدمی سیدھے سیدھے اپنے مطلب کی بات کرے۔ لمبی چوڑی تمہید باندھنے یا سننے کا بھلا کسی کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا ہے اور پھر جو چیز بھا گئی سو بھا گئی۔ اس میں گھماؤ پھراؤ یا بھاؤ تاؤ کہاں کا۔ اُسے تو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔" وہ من ہی من میں باتیں کرتی رہی۔

زمین پر ایڑی جما کر چلتا ہوا سمارٹ سا نوجوان اُسے بے حد اچھا لگا تھا۔ دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُس کی سب سے زیادہ بھا جانے والی خوبی، اُس کا چھریرا بدن اور سیدھا نکلا ہوا مناسب قد تھا۔ اُسے چھوٹے قد کے مردوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بھلے ہی وہ شکل وصورت میں یا دیگر حیثیتوں سے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ اُس کا خیال تھا کہ ظاہری طور پر اچھے لگنے والے لوگ یقیناً باطنی طور پر بھی اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لئے گزشتہ کچھ عرصہ سے وہ ایک ایسے ہی نوجوان کی تلاش میں تھی۔ وہ جہاں بھی جاتی، اُس کی نظریں کسی کو تلاشتی رہتی تھیں اور آج وہ مین چوک کے قریب ایک دکان کے باہر لگی بنچ پر بیٹھی تین بجے کا انتظار کر رہی تھی۔ دیگر کام نپٹا کر اب اُسے ایل آئی سی کی قسط جمع کروانی باقی رہ گئی تھی اور ایل آئی سی کے دفتر میں کھانے کے وقفے کی وجہ سے اکثر کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ تین بجے تک ملازمین نے اپنی اپنی کرسیوں پر دوبارہ بیٹھنا تھا اور اُسے قسط جمع کروا کر گھر لوٹنا تھا۔ وہیں بنچ پر بیٹھے بیٹھے، سامنے کی سڑک پر آتے جاتے بے شمار لوگوں میں سے ڈور سے آتا ہوا ایک نوجوان اُس کے من کو بھا گیا تھا اور اُس نے لمحوں میں ہی اُس کے بارے میں بہت کچھ سوچ بھی لیا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ نوجوان عین اُس کے سامنے سے گزرے گا اور وہ فوراً ہی کسی نہ کسی بہانے سے اُسے مخاطب کرلے گی۔ مثلاً یہی پوچھ لے گی کہ ایل آئی سی کے دفتر میں اس وقت کرسیاں کیوں خالی پڑی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اُس نوجوان کا رُخ مین چوک کے پیچھے سے

گزرنے والی سڑک کی طرف تھا اور آگے دور تک لمبے سے بازار کا سلسلہ تھا۔ وہ بھی فوری طور پر اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ جلدی جلدی چلنے لگی تا کہ اُس کے شانہ بہ شانہ چل کر اُسے قریب سے دیکھ سکے اور کوئی بات کر سکے۔ مگر دِقت یہ پیش آئی کہ بازار میں بہت ہجوم تھا۔ کندھے سے کندھا چھل رہا تھا اور وہ نوجوان آنکھوں سے اوجھل ہوا جا رہا تھا۔

وہ بڑی ہوشیاری سے کسی کو دھکیلتی ہوئی، کسی سے دھکا کھاتی ہوئی، ہجوم میں اپنا راستہ بناتی ہوئی چلتی جا رہی تھی۔ اُس وقت تو وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اُسے قسط جمع کروا کر بروقت گھر بھی پہنچنا ہے۔ آخر اُس نے دیکھا کہ نوجوان ایک دُکان میں داخل ہو گیا ہے۔ اُس نے بھی پیچھے پیچھے اُسی دُکان کا رُخ کیا۔

وہ بہت کم بازار میں نکلا کرتی تھی۔ ہجوم سے اُس کا دل گھبراتا تھا۔ بہت پہلے تک وہ خود ہجوم کا حصہ ہو جایا کرتی تھی مگر اب بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ہجوم اور رش سے اُسے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی اور وہ رش والی جگہوں پر جانے سے اجتناب کرتی تھی مگر آج اُس پُر کشش نوجوان کا پیچھا کرتے ہوئے اُسے ہجوم میں ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایک فکر سی لگتی تھی کہ وہ نوجوان اس ہجوم میں کہیں آنکھوں س اوجھل نہ ہو جائے اور وہ اُسے ڈھونڈھتی ہی رہ جائے۔

بہت دور تک بازار میں چلے جانے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ وہ ایک دُکان میں جا گھسا ہے تو وہ تیزی سے اُسی دُکان کی طرف لپکی۔ ابھی وہ دُکان کے عین سامنے پہنچی ہی تھی کہ اُس نے دیکھا، وہ دُکاندار سے کسی چیز کا پوچھ کر باہر نکل رہا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے باوجود ہشاش بشاش موڈ میں عین اُس کے راستے میں کھڑی ہو گئی اور بھرپور نظروں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اب وہ اُسے مخاطب کرنے ہی والی تھی کہ اُسکی نظریں اُس کے کھلے گریبان پر جا پڑیں اور اُس کی زبان گنگ ہو گئی اور دل دھنگ سے رہ گیا۔ البتہ دل ہی دل میں جو اُس نے کہا وہ کچھ یوں تھا ''درفٹ تیرے کی! سراپا دھوکا۔'' اُس

نے واپس پلٹنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ شکستگی، ناکامی، ندامت اور اُس سے بھی بڑھ کر اپنی بے وقوفی کے احساس کا عالم یہ تھا کہ اُسے ایل آئی سی کی قسط جمع کروانے کا خیال تک نہ آیا۔ اپنی بے وقوفی پر بیچ بیچ میں اُسے ہنسی بھی آتی رہی۔ آنکھوں کی کم ہوتی ہوئی بینائی پر بھی افسوس کرتی رہی مگر زیادہ لعنت ملامت وہ اُسی کی کرتی رہی۔ ''بے وقوف! چوک کر بیٹھا۔ خیر، کوئی نہ کوئی ثبوت باقی رہ ہی جاتا ہے۔ لاکھ جتن کے باوجود بھی۔ ورنہ کوئی چور، کوئی ڈاکو اور کوئی قاتل کبھی پکڑ میں نہیں آتا۔''

''اور اگر اُس نے سینہ بھی ڈائی کر لیا ہوتا تو!'' اس خیال سے اُس کی زبان دانتوں تلے آ گئی۔ ''میں نے اُس پر اپنا مقصد واضح کیا ہوتا اور وہ اس وقت مجھ پر ہنس رہا ہوتا اور میری نقل یوں اُتار رہا ہوتا۔ ''سنو! میری ایک جواں سال خوبصورت لڑکی ہے۔ مجھے بالکل آپ جیسا سمارٹ سا داماد چاہیے۔ تم چاہو تو آج ہی میرے ساتھ چل کر لڑکی دیکھ سکتے ہو۔'' گھر واپسی تک وہ اسی طرح کی کئی دیگر سوچوں میں اُلجھی رہی۔

''پہلے وقتوں میں لوگ چالیس پچاس سال کی عمر میں دادا، دادی اور نانا، نانی بن کر انتقال بھی کر جایا کرتے تھے۔ ہمارے دادا جی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چالیس پینتالیس کی عمر میں تھے۔ چوتھی شادی کی تیاری کر رہے تھے کہ فوت ہو گئے۔ تاہم اُس وقت تک وہ نانا اور دادا بن چکے تھے۔ اب کے چالیس کی عمر میں بعض لوگ پہلی شادی کرتے ہیں اور پچاس ساٹھ سال تک جوان بنے رہتے ہیں۔ پہلے ملازمت میں آنے تک کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس سال تک تھی، اب کہ اڑتیس سال تک بڑھادی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اگر ریٹائرمنٹ کی عمر موجودہ مدت سے کچھ زیادہ بڑھادی جائے تو کچھ بُرا بھی نہیں ہے......''

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچی۔ پرس بستر پر دے مارا اور جلدی سے کپڑے بدلنے لگی۔ کپڑے بدلتے بدلتے ہی وہ پکار اُٹھی۔ ''نادیہ اری او نادیہ! آج تو غضب ہو گیا میرے ساتھ۔'' فکرمندی نادیہ سامنے آ کھڑی ہوئی تو وہ بولی ''میں تمہارے اُوپر لگائی پابندی

آج سے ختم کرتی ہوں۔ آج سے تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ میری نظریں بوڑھی ہوگئی ہیں۔ اب تو مجھے ان پر کوئی اعتبار نہیں رہا ہے اور تم اپنی جوان نظروں سے اپنی پسند کا کوئی لڑکا چُن لو۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔''

نادیہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ گھر پہنچتے ہی ممی نے اُس کی شادی کی بابت باتیں شروع کردی ہیں اور برابر بولتی جا رہی ہیں۔ ''نظریں، جو صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے کرتی ہیں، دھوکا بھی کھا سکتی ہیں۔ بوڑھی نظریں تو یقیناً فریب کھاتی ہیں۔ اس کا مجھے آج تجربہ ہوا۔''

''ہوا کیا ممی؟'' اپنی ممی کی سنجیدگی کو بھانپتے ہوئے نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔ تو وہ بولی۔ ''ہوا یہ کہ آج بازار میں، میں تیرے لئے ایک بوڑھے پر لٹو ہوگئی۔ میں بھی کیا کرتی، وہ مواسر سے پاؤں تک خضاب زدہ تھا۔ اُوپر سے لباس بالکل جوان لڑکوں کا سا۔ میں تو گھنٹہ بھر اُس کے تعاقب میں بھاگتی، دوڑتی رہی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ بات کرنے سے پہلے ہی میری نظریں اُس کے سینے پر پڑ گئیں۔ روکھے، سفید اور بے جان بالوں سے پتہ چلا کہ پچاس سے کم کا نہیں ہے۔ میں تو توبہ کرتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی.......... ''نادیہ''۔۔۔! '' کہتے ہوئے پاؤں پٹخ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

خوشبو

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی

اپنے کپڑوں کی گٹھری لے کر وہ بیگم صاحبہ کے گھر کے اندر آئی اور کمرے کو دیکھنے چلی گئی۔ اُس کو کمرہ کرایہ پر چاہیئے تھا۔ حاجی صاحب کو کرائے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اُسے ایک ایسی فیملی کی ضرورت تھی جو اُن کے گھر کی رکھوالی بھی کرتے اور کرایہ بھی دیتے۔ رقیہ کو کمرہ پسند آیا اور بیگم صاحبہ نے بھی اُس کو بہت کم روپیوں کے عوض کمرہ کرایہ پر دے دیا۔ رقیہ کے ساتھ اُس کا شوہر اور اُس کا ایک بچہ بھی تھا۔ وہ ہندوستان کے کسی مسلمان علاقے سے تعلق رکھتی تھی اور اُس کا رہن سہن پنجابیوں جیسا تھا۔

رُقیہ دن میں ہزار بار بیگم صاحبہ کے پاس آتی۔ کبھی روٹی مانگتی، کبھی پلیٹ، کبھی جھاڑو، کبھی یہ کبھی وہ۔ کیونکہ آہستہ اُس کو گھر بنانا تھا۔ اُس کو جس چیز کی ضرورت پڑتی تو پہلے بیگم صاحبہ کے پاس پوچھنے کے لئے آتی۔ اصل مین بیگم صاحبہ نے ہی اُسے یہ ہدایت دی تھی، کیونکہ اس کے گھر میں اتنی فالتو چیزیں تھیں کہ وہ سوچتی تھی کہ اگر کوئی چیز نکل جائے تو بہتر ہے۔

اس کے اپنے بچے تو باہر کے شہروں میں پڑھتے تھے۔ میاں بیوی ماں کو لے کر اکیلے اتنے بڑے بنگلے میں رہتے تھے۔ اسی لئے سوچا تھا کہ ان وک اوٹ ہاس میں رکھا جائے۔ رقیہ بھی کیا کم تھی۔ وہ ان کا احسان نہیں لیتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں کچھ بھی پکاتی تھی تو بیگم صاحبہ کے لئے پلیٹ میں لے کر آتی۔ وہ بیگم صاحبہ کو دیدی کہہ کر پکارتی تھی۔ حالانکہ وہ

اس کی آنٹی کی عمر کی تھی مگر دیدی دیدی کہتے اُس کا منہ نہیں تھکتا تھا۔ کبھی پلاؤ، کبھی گوشت، کبھی پکوڑیاں، کبھی وہ تو کبھی یہ لے کر آتی۔ بیگم صاحبہ اُس کو منع کرتی رہتی مگر وہ ماننے والوں میں کہاں تھی۔ کچھ دنوں پہلے ہی تو بریانی لائی تھی اور وہ بھی گوشت کی۔ پکاتی تو وہ بڑا مزے دار تھی۔ مگر حاجی صاحب جونہی اُس کو دیکھتا تھا، تو آگ بگولہ ہو جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی چیز اپنے گھر میں دیکھتا تو اُس کا منہ غصے سے لال پیلا ہو جاتا۔

''آخر آپ کو غصہ کیوں آتا ہے؟'' .... اُس کی بیگم اُسے پوچھتی۔

''اس کی چیزیں نہ لیا کرو بیگم۔ اس سے بد بو آتی ہے۔ جونہی وہ گھر میں داخل ہوتی ہے، سارے گھر میں اس کی بد بو پھیل جاتی ہے۔ مجھے تو اُس کو دیکھ کر ہی گھن آتی ہے۔ پلیز بیگم اسے یہاں آنے سے منع کیجئے۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتی ہوں۔ کیسے کہوں کہ تمہارے بدن سے بد بو آتی ہے۔'' ...اس کی بیگم نے منع کر دیا۔

دن گزرتے گئے۔ رقیہ کا شوہر کشمیر آ کر ترکھانی کا کام کرتا تھا۔ صبح سویرے گھر سے نکلتا تھا اور شام گئے واپس لوٹتا تھا۔ رُقیہ پاؤں میں پایل پہن کر دن بھر چھم چھم کر کے اِدھر سے آتی اور اُدھر جاتی۔ بیگم صاحبہ کسی اسکول میں پرنسپل تھی اور حاجی صاحب ایک بہت بڑے آفیسر تھے۔ بیگم صاحبہ نے رقیہ سے صرف اتنا کہہ دیا کہ ...... ''جب صاحب گھر کے اندر ہوں تو تم اندر مت آیا کرو۔ اچھا نہیں لگتا'' ...... ایسے دونوں کی بات رہ گئی۔

اب تو اس نے ان کے وہاں آنا ہی کم کر دیا تھا۔ چاہے حاجی صاحب گھر میں ہوں یا نہ ہوں۔ اُس نے آہستہ آہستہ اب چیزیں لانا بھی کم کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو بھی اچھا لگتا تھا کہ وہ اپنے گھر کا کام اپنے گھر کے اندر کرے اور اُسے بھی چین سے بیٹھنے دے۔ اس کو حاجی صاحب کے ساتھ کھٹ کھٹ کرنا اچھا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی وہ مفت میں کچھ مول لینا چاہتی تھی۔

ادھر رقیہ کو بھی اندر ہی اندر کھٹک رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ وہ دروازے سے ہی کبھی سلام دُعا کر کے چلی جاتی تھی۔

حاجی صاحبہ بہت شستہ مزاج کے آدمی تھے۔ وہ اپنی بیوی کے ہاتھوں کا صاف شفاف، کسا ہوا، تلا بھنا، اچھا اچھا اور لذیز کھانا کھانے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ بھی دن بھر کے کام کاج اور مارا ماری کے بعد سکون کی سانس گھر میں چاہتے تھے۔ ماں بچاری ایک کونے میں پڑی رہتی۔ کھانے کو کہتے تو آجاتی، نہیں کہتے تو نہ آتی، مانگتی نہیں تھی۔ گھر میں نوکر چاکر بھی اب نہیں تھے۔ بیگم صاحبہ خود پکاتی تھی اور خود گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ کبھی جب حاجی صاحب کے دل میں مروت جاگ جاتی تو وہ دو برتنوں کو ہاتھ لگتے، یا کبھی بیگم بیمار ہوتی تو بس مرغا پکا لیتے تھے۔ مرغا تو اب اُن کو خوب پکانا آتا تھا۔ کچے پیاز کی چٹنی بھی اب خوب بنا لیتے تھے۔ بیگم صاحبہ اُن سے کہتی تھی......

"اب تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ کبھی رات کو میکے جانا ہوا، تو آپ تو سب کچھ کر ہی لیں گے"۔

"ہاں ہاں بیگم کیوں نہیں۔ اب تو مجھے پریکٹس ہوگئی ہے۔ آپ چلی جائیں جہاں جانا چاہتی ہیں۔ ہم مرغا پکا کر کھائیں گے۔"

بہت دنوں کے بعد بیگم صاحبہ کے ابا نے ان کو فون کیا۔ بیگم صاحبہ فون پر رو پڑی۔ وہ کہہ رہی تھی......

"جی ابا، ضرور آؤں گی"

"نہیں نہیں۔ ماں باپ کو تھوڑا بیٹیاں بھولتی ہیں"

"آپ خفا نہ ہوں۔ بس ایک دو دن میں حاضر ہو جاؤں گی"

"جی جی...... وہ بھی خیریت سے ہیں۔ ابا، انشاء اللہ"

"جی جی ضرور...... دیدار تو ہم آپ کا کریں گے ابا"

''قبلہ تو آپ ہیں...... ابا آپ نے مجھے رُلا دیا۔''

سارا دن بیگم صاحبہ کے کانوں میں ابا کا یہ جملہ گونج رہا تھا......

''تم آتی تو میں تمہارا دیدار کرتا......''

اور اُس کی آنکھوں سے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ ابا اب اصل میں عمر رسیدہ ہو چکے ہیں۔ اسی لئے وہ بچوں کی طرح حرکتیں کرتے ہیں۔ اب ہمارا دھیان اُن کی طرف زیادہ ہونا چاہیے۔

حاجی صاحب کے گھر آتے ہی اُس نے ابا کے فون کے بارے میں بتا دیا۔ حاجی صاحب کہنے لگے......

''بیگم آپ کو جانا چاہیے تھا۔ آپ نے میرا انتظار کیوں کیا''

''خدارا جائیے۔ اپنے والد کو یوں نہ تڑپائیے''

بیگم بھی خوشی خوشی اپنے میکے جانے کے لئے تیار ہوئی۔

اب کی آنکھیں اُسے دیکھنے کو جیسے ترس گئیں تھیں۔ ویسے بھی ابا سے ملے ہوئے بہت عرصہ بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر جب سے امی کی وفات ہوئی تب سے ابا کی نظر سارا دن دروازے پر رہتی ہے کہ بیٹی کبھی تو دروازے سے اندر آئے گی۔

بیٹی تو ماں باپ کے لئے راحت کا اور چین کا سامان ہے۔ حالانکہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی کتنے ہی لوگوں کی ناک بھوں چڑھتی ہے۔ مگر بیٹیاں تو بیٹیاں ہیں۔ ماں باپ کی راج دُلاریاں ہوتی ہیں۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہوتی ہیں۔

ابا نے بیٹی کو دیکھ کر ہی من بنا لیا......

''آج میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ آج رات تم میرے پاس رُک جاؤ گی۔ حاجی صاحب ماں کے ساتھ گزار لیں گے'' بیٹی نے بھی زیادہ چوں چرا نہیں کیا۔ حاجی صاحب سے فون پر اجازت لے لی۔ باپ بیٹی میں خوب باتیں ہوئیں۔ گلے شکوے بھی ہوئے اور آخر کار

سب کچھ اچھا ہوا۔ دوسرے دن بیگم گھر آ گئی۔

اُس نے گھر کے اندر قدم رکھا بھی نہیں تھا کہ اُسے لگا کہ آج اُس کا گھر ایک انجانی مگر بہت ہی عمدہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ نہ تو وہ اُس کے شوہر کی پرفیوم کی خوشبو تھی اور نہ ہی اُس کے اپنے پرفیوم کی۔ اُس کا دماغ اندر آتے ہی معطر ہو گیا۔ وہ مستقیم ماں جی کے کمرے میں چلی گئی۔ خیر و خبر کے بعد پوچھنے لگی......

''یہ کیسی خوشبو ہے آج یہاں ماں جی''

''خوشبو...... بیٹی مجھے تو معلوم نہیں۔ مجھے تو خوشبو بھی نہیں آ رہی ہے'' وہ سوچنے لگی جانے کس نے اپنی تشریف آوری سے میرا سارا گھر مہکا دیا۔ وہ ابھی اُس مہمان کو ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ کسی کی آہٹ نے اُسے چونکا دیا، اور...... رقیہ...... دبے پاؤں اُس کے گھر سے نکل رہی تھی اور خوشبو کا ریلا اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

بھوک

ساجد حسین دن بھر کی ڈائیونگ سے تھک چکا تھا۔ مگر وہ رک نہیں سکتا تھا۔ ابھی اس کو گلمرگ پہنچنا تھا۔ چونکہ دیر بھی بہت ہو چکی تھی اور اندھیرا چھا جانے میں وقت بھی نہیں لگتا ہے۔ کیونکہ شام کو وقت قریب تھا۔ مگر اس کو چلتے رہنا تھا۔ جب تک وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا۔
رات کے دو بجے وہ گلمرگ کی ایک اُس پہاڑی پر پہنچا جہاں اس نے اپنے لئے ایک ہٹ (hut) بُک کی تھی۔ رات کا وقت اور تھکاوٹ بہت زیادہ، اور اس پر بھوک نے حشر برپا کر لیا تھا۔ سب کچھ برداشت ہو سکتا تھا مگر کمبخت بھوک ایسی تھی کہ برداشت سے باہر تھی۔ مگر اس وقت اسے ملتا تو کیا ملتا۔ اسی پریشانی اور تذبذب کے عالم میں کتنا وقت گذر گیا کہ کہیں سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ ساجد حسین نے شکر کیا کہ اب شاید کچھ کھانے کا موقع ملے گا۔

نماز نہ پڑھنے کی طرف شیطان نے اپنے سارے ہتھکنڈے آزمائے۔ اور وہ کامیاب ہو گیا۔ اور اس نے اس وجہ سے نماز چھوڑ دی کہ پہلے پیٹ کے جہنم کی آگ بجھاؤں اور اسکے بعد جنت کماؤں۔

پو پھٹی تو یہ پہاڑیوں کی تیرگی کو چیرتے ہوئے آگے بستیوں کی طرف جانے لگا۔ دور سے اس کو چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے دروازوں پر رنگ برنگی پھول کاری کی گئی تھی۔ ان کی دیواروں پر مٹیالے پانی سے لیپائی کی گئی تھی۔ جس

کے اوپر بھی مختلف رنگوں سے پھول بنائے گئے تھے۔ جو بہت دیدہ زیب لگ رہے تھے۔

ساجد ایک کٹیا کے پاس پہنچا اور بڑی جرأت کرکے دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا...... دروازے کے اندر سے...... گائے کی بو...... اسکے نتھنوں کے ساتھ ٹکرائی اور اس نے سر الٹا باہر نکالا۔ ناک کے نتھنے دو انگلیوں سے بند کیے۔

''کہیں یہ گھوڑے اور گائے کا اصطبل تو نہیں...... اس میں کوئی انسان کیسے رہ سکتا ہے۔ نہیں مجھے کہیں اور جانا چاہیئے۔''

وہ آپ ہی آپ بڑ بڑایا۔ ''مجھے کہیں اور جانا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کھانے کو کچھ مل جائے''۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے قدم کٹیا کے اندر تھے۔

اس نے دیکھا کہ اس کٹیا کو اندر سے کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں گائے اور اس کا ایک بچھڑا تھا۔ دوسرے حصے میں میلا کچیلا بستر ا بچھا ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ابھی اس میں سے کوئی باہر نکل آیا ہے۔ ایک اور حصے میں باورچی خانے کا سامان رکھا گیا تھا۔ چم چم کرتے ہوئے سٹیل کے چند گلاس، چند پلیٹیں اور کچھ ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ ایک جگہ چولہا جل رہا تھا اور چولہے کے سامنے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی شاید چائے بنا رہی تھی۔ اندر آتے ہی ساجد نے پوچھا۔

''کیا مجھے کھانے کو کچھ مل سکتا ہے......''؟؟ لڑکی خاموش رہی۔

ساجد نے اپنا سوال دہرایا۔ ''کیا کھانے کو کچھ مل سکتا ہے''؟؟ لڑکی پھر خاموش رہی۔ جیسے سوال اسکی سمجھ سے باہر تھا۔

وہ لڑکی بچپن اور جوانی کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ اس کے ٹماٹر جیسے لال چہرے پر چولہے کی گرمی کی وجہ سے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ساجد پھر ایک قدم اندر آیا اور اپنا سوال دہرایا۔

''کھانے کو کچھ ملے گا۔ چائے...... یا روٹی...... یا کچھ اور...... میں کل سے بھوکا

ہوں......"

"لڑکی شرمائی اور لجاتے ہوئی بولی۔

"بابا باہر گئے ہیں کچھ لانے کے لئے ہی۔ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔"

چولہے میں آگ جل رہی تھی جس کی روشنی لڑکی کے چہرے کو اور بھی جلا بخش رہی تھی۔ آج کی تپش اس کے گالوں کو اور بھی تپا رہی تھی۔ وہ ذرا قریب آیا۔ ایک دم سے اسکا ہاتھ گریبان کی طرف گیا۔ وہ اپنے بٹن سنبھالنے لگی اور اپنی چادر سے اپنی جوانی ڈھکنے لگی۔

ساجد چولہے کی آگ کو لڑکی کے چہرے پر دیکھ کر جھلس گیا۔ اپنے آپ پر قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیٹ کی بھوک کو بھول ہی گیا......

"بابا کہاں گئے ہیں...... کتنی دیر میں آئیں گے......؟"

اسکی آنکھوں میں خمار سا آنے لگا اور وہ لڑکی کے اور بھی قریب گیا...... اور......

وہ اپنے لباس کی سلوٹیں صحیح کرنے لگا۔ جیب سے ایک سو روپئے کا نوٹ نکال کر لڑکی کی ہتھیلی پر رکھا۔ اور اسکی آنکھوں میں جھانکا۔ سو کے نوٹ کو دیکھ کر لڑکی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور شرماتے ہوئی بولی۔

"بابو جی...... پھر کب آؤ گے۔؟"
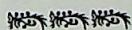
شفق رنگ شباب

ڈاکٹر نکہت نظر

آسمان پر شفق پھیلاتا ہوا سورج اپنے آخری پڑاؤ پر تھا اور شفو لہو رنگ آسمان پر ڈوبتے سورج کو الوداع نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اکثر یہ منظر دیکھتی اور اداس ہو جاتی....... سورج کے ڈوب جانے پر اس کے دل میں کسک سی اٹھتی اور اسے ایسا لگتا کہ کوئی عزیز اسے بچھڑ گیا ہو....... وہ جانتی تھی کہ یہ سورج قدرت کے قانون کی پابندیوں میں جکڑا ہوا....... اپنی ہی دُھن میں مگن....... سود وزیاں کو بھول کر....... بس روشنیوں کی دکان سجائے بیٹھا ہے....... بنا معاوضے کے....... برابر کی روشنیاں بانٹتا ہوا....... کسی تفریق کے بغیر....... فقیر شہر کے جھونپڑے سے لے کر قصرِ شہنشاہی تک ایک ہی جیسی کرنوں کی بارش....... روشن روشن کرنیں....... اندھیروں کو پاش پاش کرتی ہوئی کرنیں....... شفق کے دل میں اکثر ایک ننھی سی خواہش اپنا سر ابھارتی.......

کاش....... روشنیوں کے اس سوداگر کو وہ اپنی گرفت میں لے سکتی اور

اپنی پھیکی زندگی میں اجلے اجلے....... خوبصورت رنگ بھرتی.......

لیکن سورج تو اس کی پہنچ سے پرے تھا....... کیسے اس کے ہاتھ آتا۔

شفو نے جلتے سورج کی تمنا میں ایک دن اپنی تمام محبتیں اس کے نام کر دیں....... اُس نے یہ سنا تھا کہ ایسی باتیں بس یونہی ہوا کرتی ہیں۔ اس پر کسی کا بھی بس نہیں چلتا، لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ڈھلتی عمر نے شفو کو تنہائی کے اس موڑ پر لا کر کھڑا کیا تھا جہاں اداسیوں کے سایے گہرے ہو کر اپنے دائرے پھیلاتے تو وہ دائرے بڑھ کر شفو کو اپنے حصار میں لے لیتے۔

مدتوں بعد اب کہیں جا کر اُسے تنہائی میں انجمن سجانے کا ہنر آ گیا تھا۔اس کی آنکھوں نے ایسی کتنی ہی شامیں دیکھی تھیں جب مغرب کے اُس پار ایک سیاہ دیو سورج کو نگل جاتا تو اُسکا دل بجھنے لگتا....... بس اُداسی کے سیاے اس کے آس پاس ڈیرا ڈال کر بیٹھ جاتے اور اس کی اداس آنکھوں کے آگے جب کالی رات دھیرے دھیرے اپنی سیاہ زلفوں کی گرہیں کھولنے لگتی تو تنہائی میں انجمن سجانے کا وقت آ جاتا۔وہ واپس اپنے کمرے میں لوٹ آتی....... پینٹنگ برش ہاتھ میں لے کر اُجلے اُجلے رنگوں سے اپنے من کے گھور اندھیرے کو روشن کرنے کی کوشش میں جٹ جاتی....... مدتیں ہوئیں....... شفو کو رنگوں کا یہ کاروبار کرتے ہوئے مگر رنگ صرف مہکے مہکے اور اجلے اجلے۔آج تک وہ اتنی تصویریں بنا چکی تھی کہ اس کے کمرے پر کسی آرٹ گیلری کا گماں گزرتا....... اس نے آرٹ میں کوئی باضابطہ ڈگری نہیں لی تھی....... اور نہ ہی یہ ہنر اسے وراثت میں ملا تھا....... بس رنگ، برش، کینواس سامنے آتے ہی اُسکی انگلیاں دھڑکنے لگ جاتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی ان دیکھے....... اجلے اجلے مناظر کینواس پر اترنے لگتے۔جن کو دیکھ کر لگتا کہ مصوری واقعی رنگ اور لکیروں کا کھیل نہیں بلکہ ان کے خالق کے لہو کی آمیزش کی مہک رچی بسی ہوتی ہے....... اُس کی باتوں سے اکثر یہ احساس ہوتا کہ وہ بوند بوند تمام رنگوں کو اپنی شریانوں میں اتارنا چاہتی ہے۔اپنے من کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے اسنے ہمیشہ رنگوں اور روشنیوں کی تمنا کی۔

اندھیرے تو کسی کسی کو ہی راس آتے ہیں کیونکہ زندگی کے کئی کڑوے سچ اندھیروں میں ہی اپنے پورے قد کے ساتھ برہنگی کی حالت میں نظر آتے ہیں۔شاید شفو کے اندر سچ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی اسی لیے اندھیرے ہمیشہ سے اسے خوفزدہ کرتے آئے ہیں۔اس کو اکثر لگتا کہ یہ اندھیرے بہت ہی طاقتور ہیں۔یہ جلتے سورج پر لمحے بھر میں ہی حاوی ہو جاتے ہیں اور سورج اپنی پوری آب و تاب کے باوجود خود کو اندھیروں کی پناہوں میں دینے کے لیے بے بس ہو جاتا ہے۔ویسے تو اندھیروں میں ڈوبنے کے لیے بہت بڑا دل چاہیئے.......

ٹھیک سورج کی طرح.......

پھر نہ جانے کہاں سے ایک آواز دعا کی صورت شفو کے لبوں پر اُتر آئی.......

''کاش .... مجھے بھی اندھیروں میں ڈوبنے کا ہنر عطا ہوا! یا پھر میرے حصے کے آسمان پر سورج چمکتا ہی رہے۔ صدا کے لیے....... اور رنگ رنگ کی روشنیوں پر صرف اور صرف میرا نام لکھ دے....... اپنی گرم گرم شعاعوں کی اوڑھنی کر میرے ٹھٹھرتے بدن کو تمازت بخشے.......''

شفو کی سہیلی نازنین برسوں پہلے ہی اس کو ''سورج دیوانی'' کا خطاب عطا کر چکی تھی اور اکثر اس کے دیوانے پن کو ہنسی میں اڑاتی .... لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شفو کی روح کا....... سورج کی ذات میں تحلیل ہونے کا خوف اسے ستا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ اُس کی سہیلی کا وجود قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے اور پیاسی زمین ان قطروں کو اپنی تپتی کوکھ میں سمانے کے لیے بے تاب ہے....... وہ کانپ اٹھتی اور شفو کو سمجھانے کی کوشش میں جُٹ جاتی۔

''شفو تمہارا نام ''شفق'' ضرور ہے لیکن اس جلتے سورج کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ نہیں....... تمہارے دل کی دنیا کا سورج کوئی انسان ہی ہوسکتا ہے....... جو تمہیں پیار کے بدلے پیار دے....... اس سورج نے تمہیں چمکتی کرنیں تو دی ہیں....... لیکن ایک اندھیری دنیا تمہارے نام کر چکا ہے یہ....... شاید تمہیں اس کی دوریوں کا اندازہ ہی نہیں ہے....... کیا تم اچھل کر اس کو چھو سکتی ہو؟ پل بھر کے لیے اس کے تپتے رخسار پر اپنی نظریں جما سکتی ہو؟ نہیں .... شفق نہیں یہ تمہیں اپنی طرف جی بھر کے دیکھنے بھی نہیں دے گا....... اس کی

قربت تمہیں خوشی دے سکتی ہے لیکن صرف خوابوں میں .... حقیقت
کی دنیا میں تو یہ پیار کے دو بول بھی نہیں بول سکتا....... کتنی بار تم سے
کہہ چکی ہوں کہ اس کمرے کے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ جس کا ایک
الگ ہی رنگ ہے۔ شفق آج تم میری ایک بات گانٹھ باندھ کر یاد رکھو۔
جلتے سورج کے عکس کو اپنے من کے کینواس پر اتارنے کی کوشش مت
کرنا....... دیکھنا جل جاؤ گی......."

اس دن بھی شفق مسلسل خاموشی سے اپنی سہیلی نازنین کو سنتی رہی اور اپنی پینٹنگ کو ایک
ایک کر کے دھوپ میں لگاتی رہی....... پینٹنگس کو دھوپ دکھانا....... گرد جھاڑنا اور پھر
احتیاط سے رکھنا شاید یہ عمل شفق کے اندر کے درد کے لیے مرہم ثابت ہو رہا تھا۔ نازنین اس
کی خاموشی دیکھ کر ایک بار پھر بول اُٹھی۔

"شفق! کبھی تو اپنے آپ کو ٹٹولنے کی کوشش کرو....... تمہیں اپنے
اندر محبت کے سوئے ہوئے....... ننھے جذبوں کی دھڑکن سنائی دے
گی اور جب کسی انسانی لمس کا احساس تمہارے دل کو چھو کر کسی ٹھنڈی لہر
کی طرح گزر جائے گا تو ان سوئے ہوئے جذبوں کو زبان عطا
ہوگی....... یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے کہ سورج تمہیں اپنے حصار
میں لے بیٹھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم خود اپنے اندر اندھیروں کو پال رہی
ہو۔ اگر تمہیں روشنیاں اتنی ہی عزیز ہیں تو تم کسی انسان کے پیار کی
روشنیوں کو سمیٹ لو۔ انسانی محبتوں کی روشنیوں میں بہت تمازت
ہے....... بس ایک ہی کرن تمہارے اندر کے اندھیروں کو پاش پاش
کردے گی۔ ابھی بھی وقت ہے۔ یہ آفتاب پرستی چھوڑ کر محبت کے
رشتے کی خوش نما چادر اوڑھ لو....... دیکھنا....... تمہاری روح روشن

ہو گی۔ شفق تم ہمیشہ ایسی تو نہ تھی۔....... یاد ہے تمہیں....... بچپن میں
تم گھر کی چھت پر بیٹھ کر مجھ سے اکثر کہا کرتی تھی۔

''نازنین!!! اس محلے میں سب سے اونچے گھر میں میرا بیاہ ہوگا۔'' پھر اچانک تمہاری انگلی کے اشارے کی زد میں محلے کا وہ سب سے اونچا مکان آجاتا....... اور پھر تم میرے کان میں آکر کہتی....... ''تم جانتی ہو....... میرے جہیز میں کیا کیا ہوگا....... ڈھیر سارے برش....... رنگوں سے بھرا ہوا ایک بکسا اور ہاں....... ایک بڑا سا کینواس بھی....... ''لیکن شفق....... رنگ برش اور کینواس تو تمہیں یاد رہے، باقی سب کچھ بھول گئی.......''

شفق کی آنکھیں اُمڈتی جھیل بن گئی لیکن اسنے اپنی لمبی پلکوں کو کنارا بنا کر امڈتی جھیل سے ایک قطرہ بھی چھلکنے نہ دیا....... وہ بھری ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

''نازنین۔ کہاں بھولی ہوں....... ایک ایک بات یاد ہے....... یاد ہے محلے کا وہ سب سے اونچا گھر....... لیکن اس اونچے گھر کے لوگوں کو کبھی بھی مجھ پر نظر ہی نہ پڑی....... زندگی میں کئی خوشنما موسم بیتے....... چاہتوں کے کئی گلاب کھلے....... مہکے....... اور مرجھا گئے۔ لیکن وہاں کسی بھی حادثے کی خبر نہ ہوئی اور نہ ہی کبھی اس اونچے مکان کی اونچی فصیلوں نے میری چاہتوں کے گلابوں کی خوشبوؤں کو اندر جانے کا موقعہ دیا۔ بس اب تو خوشنما موسم جیسے روٹھ ہی گئے ہوں۔''

نازنین نے شفق کا کانپتا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''شفق! تم چاہو تو تمہاری مرجھائی زندگی میں ابھی بھی ان خوشنما موسموں کا گذر ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اونچے مکان کی اونچی فصیلوں کے اُس پار رہنے والوں نے تمہارے گھر کے دروازے پر دستک دینے کا فیصلہ کیا ہے....... بس تم پلٹ کر تو دیکھو....... وہی خوشنما موسم

تمہارا منتظر ہے بس تمہیں آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنا ہے۔"

شفق درد بھری آواز میں کہنے لگی۔

"نازنین....... بہت دیر ہو چکی ہے اب....... میں نے تپتے سورج کی اجلی کرنوں کو اپنی روح میں اتار لیا ہے۔ اس کے تپتے لمس کا احساس لہو بن کر میری شریانوں میں دوڑ رہا ہے....... تمہارے ساتھ کیسے چلوں....... دیکھو میں نے آج اپنی تمام پینٹنگس دھوپ میں پھیلا رکھی ہیں۔"

لیکن نازنین کی ضد کے آگے شفق کو جھکنا ہی پڑا اور ان دونوں کے قدم دھیرے دھیرے محلے کے اس اونچے مکان کی اور بڑھنے لگے۔ جس میں شفق کا اَن دیکھا اور اَن چھوا پیار موجود تھا۔ گھر کی دہلیز پار کرتے ہی شفق کا سامنا رفیق سے ہوا جو اپنی ویل چیئر پر لاچاری کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا....... اس کی التجائی نظریں....... شفق کے ڈھلتے شباب پر بالوں میں چاندی کی کرنیں....... نازنین کو وقت کی تیز رفتاری کا احساس ہو رہا تھا۔

اچانک آسمان کے سینے پر بادلوں کی اوڑھنی پھیلتی گئی اور سورج آسمان کے پہلو میں چھپ گیا یا پھر شفق کی آفتاب پرستی ماند پڑ رہی تھی۔ چند لمحوں میں ایسا لگا، جیسے سورج شفق کی بے لمس محبت کی تپش سے پگھل پگھل کر زمین پر بوند بوند برسنے لگا۔ شفق پلٹ کر بے تحاشا اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ چھت پر پھیلی ہوئی اس کی تمام پینٹنگس بھیگ چکی تھیں اور سارے رنگ بہہ گئے تھے۔

گاشی

جنم جلی .... کم بخت .... کلموہی .... نامراد .... کانوں میں اس طرح کی آوازیں پڑتے ہی وہ گرتی پڑتی خوشی خوشی حاضر ہو جاتی۔ اُجالا اس کی زندگی سے کوسوں دور تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر ماں نے اُس کا نام گاشی رکھا۔ جب پیدا ہوئی، تو کسی نے کہا۔ ''بچی کی آنکھیں گرہن کا شکار ہوئی ہیں۔'' .... مگر گرہن تو سورج کو لگا تھا اور اندھیرا گاشی کو نگل گیا۔ اس کی آنکھوں کے کواڑ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیل بند ہو گئے .... کسی نے صلاح دی۔ کہ گاشی کو مخدوم صاحب کے آستانے کے نچلے زینے پر چھوڑ دیا جائے .... جنم جلی .... کم بخت .... کلموہی .... نامراد .... ذرا سا قد کیا نکال لیا .... ماں کو کھا گئی۔ اکثر باپ کے غصے کا شکار ہوتی رہتی۔ اٹھتے بیٹھتے دھتکاری جاتی .... بیچاری بن ماں کی بچی .... گھر باہر اندھی گاشی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

اندھی گاشی کو اندھیروں کے مضبوط حصار جکڑے تو تھے ہی۔ باپ کی پہرے داری میں گھر کی چار دیواری بھی کسی قید خانے سے کم نہ تھی۔ ابا کے گھر کے باہر جاتے ہی گاشی کا بچپن کھلکھلا اُٹھتا۔ سہمی سہمی اندھی گاشی ہواؤں سے سرگوشیاں کرتی .... اور کسی پرندے کی طرح اپنے پر تولتے ہوئے .... آزاد پنچھیوں کے جھنڈ کے ساتھ دور افق تک اڑان بھرتی۔ ہوا کے پروں پر سوار کائنات کے تمام رنگوں کو اپنی بند مٹھیوں میں بھر کر ابا کے لوٹنے سے قبل ہی لوٹ آتی۔ صیاد شاطر ہو تو پرندوں کو چالاکیاں آ ہی جاتی ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کے ناپختہ ارادوں کی کچی عمارت کو مضبوطی عطا ہونے لگی۔ پھر ایک روز روشنی کی کرن

اندھی گاشی کی شیریانوں میں سے گذر کر اس کے من کی آنکھیں روشن کر گئی........ اس کے بعد شاید ہی اندھی گاشی کو انگلیوں سے ٹٹولنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ پھر لوگوں نے کہنا شروع کیا........ اندھی گاشی تو من کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔''

عمر کی کئی اُداس بہاریں بیت گئیں۔ اب تو اندھی گاشی زندگی کا کوئی بھی موسم جھیلنے کے قابل ہو چکی تھی۔ ہوائیں اکثر اسے موسموں کے بدلنے کا پتہ دیتی تھیں لیکن موسموں سے آنکھ مچولی کا یہ کھیل زیادہ دیر چل نہ سکا۔ ایک دن ابا نے اندھی گاشی کے بھٹکتے قدموں کی دبی آہٹیں سن لیں۔ اس سے پہلے کہ بدنامی کا داغ اندھی گاشی کی بدصورتی میں اضافہ کرتا۔ باپ نے بیٹی کو اس کی بدصورتی اور اندھے پن کا بھرپور احساس دلایا۔

اندھی گاشی نے دل کے سمندر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل کرتی موجوں پر نظر ڈالی تو اسے اپنا عکس نظر آیا۔ جہاں خوبصورتی نام کی کوئی شے اس کے چہرے کے جغرافیہ میں درج ہی نہ تھی۔ برہنہ حقیقت اپنے پورے قد کے ساتھ اندھی گاشی کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ گھبرا گئی........ اور پھر دعاؤں کی صف میں ایک دعا اور شامل ہو گئی........ ''جذبوں اور خواہشوں کے گہری قبر میں دفن ہونے کی دعا''........ دُعاؤں کی مقدس صدائیں کہکشاں کی صورت اختیار کر گئیں اور آسمان کے دروازے پر دستک دینے لگیں........ اس کے بعد کئی خوشنما بہاریں بیت گئیں۔ اندھی گاشی نے دیکھی تو نہیں، بس جھیلتی رہی۔ اس کے دل کا سمندر منجمد ہو گیا اور آدھا شریر نیلگوں........ جذبات کی موجوں کی ہلچل ختم ہو گئی، یخ بستہ پانیوں کے نیچے........ موسموں کی آوارہ گردیاں جاری رہیں لیکن اندھی گاشی نے کبھی مڑ کے دیکھا ہی نہیں آنکھ مچولی تو دور کی بات تھی۔

لوگ تو چودھویں کے چاند کی تمنا کرتے ہیں مگر اندھی گاشی کا نیا پڑوسی نہ جانے کیوں اماوس کے چاند کو اپنے دل کے جزیرے پر اتارنا چاہتا تھا۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اماوس کے چاند سے روپہلی چاندنی کی تمنا کرنا نادانی ہے یا پھر........ اندھیروں سے کھیلنا اس کا شوق

ہوگا۔ اندھی گاشی کے من میں کئی سوال اُبھرے۔ لیکن ابا........ ابا نے تو بس رشتہ قبول کرلیا۔ اندھی گاشی ابا کے فیصلے پر حیران تھی........ مگر ابا کرتے بھی تو کیا کرتے........ بس ذمہ داری کی یہ بھاری بھرکم پوٹلی بوڑھے کاندھوں پر سے ایک ہی جھٹکے میں اتاردی........

اندھی گاشی نے برسوں کے بعد من کی آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ نیا پڑوسی........ کسی دیوانے چکور کی طرح اماوس کے چاند کو تکے جارہا تھا اور اپنی جوان آرزوؤں کا ست رنگی کشکول لیے جیسے اندھی گاشی سے اس کی کورنگاہی کا صدقہ طلب کررہا ہو........ آج ایک عرصے کے بعد اندھی گاشی اپنے من کے سمندر کی ننھی موجوں میں ہلچل محسوس کرنے لگی۔ رات کے پچھلے پہر مانگی گئی اس کی دعائیں بے اثر ہونے لگیں۔ اور نیلگوں بوند بوند پگھلنے لگا اور ایک دن اس کو اپنی کورنگاہی کا صدقہ نئے پڑوسی کے ست رنگی کشکول میں ڈالنا ہی پڑا۔ لیکن من کی آنکھوں سے اسنے کچھ دیکھ لیا........ وہ........ جو آنکھ والوں کو نظر نہ آیا........ ابا کو بھی اندھی گاشی کے من کی آنکھوں پر تب یقین آیا جب نیا پڑوسی اندھی گاشی کی کورنگاہی کا صدقہ بناڈکار لیے ہضم کر گیا اور ست رنگی کشکول بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اندھی گاشی کو کلی سے پھول کر کے نہ جانے کس سمت اڑ گیا۔ واپس پلٹ کر نہ آنے کے لیے........ اندھی گاشی کی مٹھّیاں اس کی بند پلکوں کی طرح بند ہی رہ گئیں........

زمین کی گردش آسمان کو اپنا سیاہ چولا اتار کر اجلی قبا پہننے پر مجبور کرتی ہے اور تب سورج کالے دیو کے چنگل سے آزادی حاصل کر کے دن کا اعلان کرتا ہے لیکن وقت کی لمبی لمبی کروٹوں کے باوجود بھی اندھی گاشی کی پیشانی پر خوش نصیبی کا تارا نہیں چمکا........ اس کے من کا پنچھی ہوا کے جھونکے کی آہٹ پر پھڑ پھڑانے لگتا اور اس کے چاروں طرف پھیلے اندھیرے ناگ بن کر اسے ڈسنے لگتے۔ یہاں تک کہ اس کا شریر نیلا ہوجاتا۔

.... پھر اچانک ایک دن اندھی گاشی کے اندر ایک جنبش ہوئی........ کونپل پھوٹی........ اور ایک کم سن شجر اس کے وجود کی زرخیز مٹی میں پلنے لگا........ مگر اس ست رنگی کشکول والے کی یاد آتے ہی وہ ننھے شجر کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتی لیکن دوسرے ہی پل اپنے چاروں اور پھیلے اندھیروں میں خود کو تنہا محسوس کرتی........ اپنے وجود کی زرخیز مٹی میں پلتے ننھے شجر کے سایے کی تمنا اسے خود رکھنے لگی۔ وہ ہر صبح دھوپ کے ٹکڑے اپنی مٹھیوں میں بھر کر اپنے بڑھتے پیٹ پر ملتی رہتی تاکہ ننھے شجر کو تمازت ملے........ اس کی آنکھوں میں اجالے کی بوندیں اتریں........ پھر رت بدلی اور ننھا شجر اندھی گاشی کے وجود سے الگ ہوگیا۔ اب ننھے شجر کی اپنی زمین تھی........ اور........ اپنے........ پیر........ آنکھوں میں اجالے کی چمکتی بوندیں........ اگر محرومی تھی تو صرف اس کے حصے کے آسمان پر اُس کا اپنا سورج جو اس کی زندگی کا ضامن تھا۔ وہ اکثر اندھی گاشی سے اپنے حصے کے آسمان کے سورج کا نام پوچھتا........ ماجی کی یادوں کے زخموں کو کریدنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ لیکن زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس عذاب سے گذرنا ہی تھا پھر وہ ایک دن اس عذاب سے بھی گذری۔ بس اُس دن اندھی گاشی نے ایک فیصلہ کیا۔ اس نے ننھے شجر کو ہی اس کے حصے کے آسمان کا سورج قرار دیا اور اسکا نام بدل کر ''آفتاب'' رکھ دیا........ چمکتا ہوا........ روشنیاں بکھیرتا ہوا........ بے جان ذرّوں میں زندگیاں بھرتا ہوا........ آفتاب........

اندھی گاشی کے من کا کنول کھلا ہی تھا کہ ابا اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد گھر کے آنگن میں غربت کا راکشش اتر آیا اور آہستہ آہستہ گھر کا ساز و سامان نگلتا گیا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اندھی گاشی نے دروازے پر لگے پتھر پر بھوک کا برتن رکھ دیا۔ شام اترتے ہی مانگے کے رزق کے چند نوالے حلق سے اترتے........ تب دوسری صبح تڑکے ہی بھوک کا برتن دروازے پر لگے پتھر پر رکھ دیا جاتا۔ ایک دن آفتاب نے دروازے پر لگے پتھر پر بھوک کے برتن میں کسی کا ہاتھ جاتے دیکھ لیا۔ اسے اپنے وجود سے

نفرت ہونے لگی۔ وہ مانگے کے رزق کے نوالے اپنے حلق سے اگلنا چاہتا تھا۔ وہ آندھی کی طرح اندھی گلیوں کو چیرتا ہوا کھلی فضاؤں سے اپنے اور اندھی گاشی کے لیے خوشیاں سمیٹنے کے لیے نکل پڑا۔ بستی میں چاروں طرف گرم ہوا چل رہی تھی۔ اعتقاد کے اونچے میناروں کے سایے ختم ہونے لگے تھے۔ جلتے سورج کی چُبھتی کرنوں نے اس کی پیاس بڑھادی۔ وہ کنویں کی جانب بڑھا۔ کنویں میں سے شعلے بھڑک رہے تھے۔ آگ ہی آگ........ تیز آنچ میں سے دو ہاتھ باہر آئے۔........ اور........ آفتاب کے سپنوں کے خریدار بنے۔ پھر........ سپنے بیچے اور خریدے گئے........ آفتاب کی پیاس بجھانے کی خاطر کئی سمجھوتے ہوئے........ زندگیوں کے........ موت کے........ دھن کے........ دھرتی کے........ پھر آفتاب دھرتی سے اوپر اُٹھ گیا........ وہ سب کچھ بھلا بیٹھا اور دہشت کا جلتا آفتاب بن کر آسمان چھونے لگا۔ برسوں تک نحوست کے تارے اس کی قدم بوسی کرتے رہے۔ پھر ایک دن لامکان کو قبضہ اختیار میں کرنے کی کوشش میں دہشت کا ایوان دہکنے لگا۔ تب اسے اندھی گاشی کے آنچل کی ٹھنڈی چھاؤں یاد آئی۔ وہ بیچاری تو جیسے کسی پچھلے جنم کے لئے کی سزا کاٹ رہی تھی۔ اب تو اس کی چہرے کی جھریوں میں من کی آنکھیں بھی الجھ جاتیں۔ بس لاشعور میں اس ننھے شجر کی مہک رچ بس گئی تھی جو ست رنگی کشکول والے کی طرح ہی اندھی گاشی کی لاچاری کو ننگا کرنے والے ایک مرد تھا۔ یہ تو بھلا ہوا ان تماش بینوں کا جنہوں نے اندھی گاشی کی لاچاری کی عریانی کو ہمدردی کی چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔

شام ہی سے اندھی گاشی گھر کے صحن میں ٹہل رہی تھی۔ اسکا من بے چین تھا۔ شام کے دھندلکوں نے اداسی کا چولا پہن کر اس کے سنسان گھر کی پہرے داری شروع کی۔ پھر اسی رات اندھیرے کے رتھ پر سوار آفتاب اندھی گاشی کے گھر کے آنگن میں اترا۔ اندھی گاشی کے دل کا جزیرہ خوشی کے آنسوؤں میں ڈوبا اور من ہچکولے کھانے لگا۔ وہ بڑ بڑانے لگی۔........

"لوگ تو پاگل ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے آفتاب میں داغ ہے........
میرے آفتاب کو گرہن نگل چکا ہے........ مجھ اندھی کے پیٹھ پیچھے
آگ کا کاروبار کرنے لگا ہے وہ........ ان کو کون سمجھائے........ یہ
تو آفتاب ہے اور آفتاب تو روشنیوں کا کاروبار کرتا ہے........"

ایک وقت تھا جب اندھی گاشی قدموں کی آہٹ سے انسان کی نیت پہچان جاتی لیکن آج اپنے سینے سے لگے ہوئے آفتاب کے فولادی جسم سے بارود کی بو محسوس نہ کر پائی۔ یا پھر........ اس کی تمام قوتیں جواب دے چکی تھیں۔

اُسی رات دہشت کی آندھیوں سے گھر کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور ماں کی گود میں سر رکھ کر سوئے ہوئے آفتاب کے چوڑے سینے پر گولیوں کی برسات ہوگئی۔

اندھی گاشی انگلیوں سے ٹٹولنے لگی........ اور اس کے دونوں ہاتھ آفتاب کے گرم لہو سے بھر گئے........

خوشبوؤں کا سفر

واجدہ تبسم گورکھو

اُس کا بچپن بھی عام بچوں کی طرح ہی گزرا تھا۔ اسکول جانا واپس آ کر کھیل کود میں مصروف رہنا اور ساتھ ساتھ پڑھائی میں بھی دل چسپی لینا اور شام کو دادا دادی کے ساتھ مستی کرنا روز کا معمول ہوا کرتا تھا بڑی ہوئی تو اُس کا لب ولہجہ رکھ رکھاؤ، طور طریقے، سوچ سمجھ اور اونچ نیچ کا سارا انداز ہی بدل گیا۔ اُس کی ہر بات دل نشین اور قابلِ رشک ہوگئیں۔ اُس کا ہمہ تن مسکراہٹ سیماب صفت اور ہر دلِ عزیز تھا۔ گھر کے سبھی لوگ جان و دل سے اُس پر فریفتہ ہیں مگر وہ بے خود و خطر گڑیا شگفتہ مزاج بہت موڈی بھی تھی۔ ہر کسی کے ساتھ مستی کرنا، کھلکھلا کر ہنسا محفل کو لالہ زار بنانا اور خوش رہنا بھی اُس کی عادتوں میں شامل تھا۔

مگر آج کچھ شگفتہ، پُر لطف، بامعنی اور موثر گفتگو میں اُس کی ساری کلفتیں دُھل گئی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر سر اُٹھا کر ایک نظر سلیم کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھا۔ سلیم کچھ شرمندہ سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ رضیہ کیا جواب دے گی مگر کچھ تھا جو وہ بولنا چاہتی تھی اور بول نہ پا رہی تھی۔ پھر بھی کوشش کی اور بول پڑی۔

"آپ نے میری عزت بڑھا دی۔ اس کے لئے میں آپ کی بہت شکر گذار رہوں گی۔" رضیہ کے ہونٹوں پر مدھم مدھم مسکراہٹ دیکھ کر سلیم جلدی کھڑا ہو گیا اور شکریہ کر کے چلا گیا۔ وہ پوری رات رضیہ کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اُسے پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے اور رضیہ کے بارے میں ماں سے بات کرے گا اور ماں انکار نہیں کرے گی۔

ایک دن سلیم نے موقعے کو غنیمت جان کر ماں سے بات کرنا شروع کی۔ سلیم اور رضیہ

بچپن کے ساتھی تھے۔ آپس میں قریبی رشتہ داری بھی تھی مگر کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے بیچ میں کچھ دوریاں آگئیں تھیں۔ بات چیت بھی بند تھی اور اب کچھ مہینوں سے آپسی تعلقات پھر سے سنور تو گئے تھے۔ ہاں مگر اتنے بھی نہیں سنور گئے تھے کہ آپس میں رشتے بھی ہونے لگے۔

رضیہ اپنے دو بھائیوں کی لاڈلی، اکلوتی اور چھوٹی بہن تھی اور وہ گھر میں ہی نہیں بلکہ باہر بھی اپنے بھائیوں پر چھائی رہتی تھی۔ اُن پر اپنا حکم چلاتی تھی۔ وہ جب اسکول سے کالج جانے لگی تو اُس نے صحیح معنوں میں تبھی دنیا کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس بھی کیا۔ وہ بہت حسین تھی۔ اور خوشبوئیں اُڑاتی پھرتی تھی۔ اُس کی ماں کو بھی اپنی اکلوتی بیٹی کی سعادت مندی پر ناز تھا۔ جو مانگتی تھی پیش کیا جاتا تھا بِنا کسی چوں و چرا کے، کیونکہ شاید اُس کے والدین کو یہ اندیشہ تھا۔ کیا پتہ سسرال جا کر اُس کی بیٹی کو اتنا پیار، دُلار یا وہ سب کچھ ملے گا جسے اُس کے سارے ارمان نکل جائیں گے۔

رضیہ کی ماں نے رضیہ کو کھلی آزادی دی تھی۔ وہ پھولے نہیں سماتی تھی کہ اُس کی بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ وہ سوچتی تھی جب تک ہم اُس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیں گے اُسے دنیاداری کی پوری خبر ہونی چاہیئے اِس لئے وہ اُسے پڑھائی کے ساتھ ساتھ غلط اور صحیح باتوں کا سبق بھی سکھاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ رضیہ پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے اور پھر اُس کی شادی کریں گے مگر گریجویشن کرنے کے بعد اُس کے والدین اُس کی شادی کے لئے فکر مند ہو گئے اور وہ اِس بارے میں سوچنے لگے۔ بہت سارے رشتے بھی آنے لگے تھے۔

یہ لمبے لمبے بالوں والی، بڑی بڑی دلکش آنکھوں والی، نازک معصوم خوبصورت بوٹا سا قد اچھے اور نیک ضمیر کی آٹے میں گوندھی ہوئی جیسے دودھ اور گلاب میں دُھلی رضیہ کے دِل میں کیا تھا گھر والے بھی نہیں جانتے تھے، جتنے بھی رشتے آئے تھے۔ ان میں سے کوئی لڑکا ڈھنگ کا نہیں ملا کیونکہ آج کل کے زمانے میں ساری چیزیں ملنی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ جہاں دولت مند اور امیر لوگ ملتے تھے وہاں تعلیم و تہذیب یافتہ بہت کم ملتے تھے اور

جہاں تعلیم وتہذیب یافتہ لوگ ملتے تھے وہاں اُس کے پاس دولت نہیں ہوتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ جہاں دولت، تہذیب اور تعلیم یافتہ لوگ یک جا ملتے تھے وہاں لڑکا ڈھنگ کا نہیں ملتا تھا۔ اس لئے گھر والے بھی ابھی کوئی فیصلہ نہیں لے پا رہے تھے۔

ایسا کرتے کرتے مہینوں کیا کچھ سال بیت گئے۔ رضیہ پورے آب وتاب کے ساتھ جوان ہوگئی۔ والدین کیلئے بیٹی کا جوان ہونا کسی پریشانی سے کم نہیں ہوتا ہے۔ اب کسی ملک کا شہزادہ ملنے سے تو رہا۔ والدین کو کوئی فیصلہ لینا تو تھا۔ اِدھر اُس کے دو بھائی بھی شادی کے عمر کے ہو گئے تھے رضیہ کی شادی ہو جاتی تو وہ بھی اپنے بارے میں اپنی شادی کے لئے کوئی فیصلہ کر سکتے تھے۔

ایک دِن واقعی گھر میں جیسے بھونچال آ گیا۔ جب رضیہ کی شادی کی بات کہیں طے ہونے والی تھی۔ والدین اور بھائی بھی اِس رشتے سے خوش اور مطمئن تھے اور رضیہ کو لڑکے والے دیکھنے کیلئے تاریخ بھی طے کر چکے تھے کہ رضیہ نے وہاں شادی کرنے سے انکار کر دیا اور سلیم سے شادی کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ یہ سُن کر گھر کے تمام لوگ حیران، پریشان اور عجیب کشمکش میں پڑ گئے اور کوئی بھی فیصلہ لینے سے قاصر رہے۔

سلیم بھی دو بہنوں میں اکیلا بھائی تھا۔ جوان، خوبصورت اور پڑھا لکھا بھی تھا۔ رضیہ سے شادی کرنے کیلئے بھی اُس کے گھر میں کسی کو انکار نہیں تھا مگر ایک بات جو آڑے آتی تھی، وہ دونوں گھروں کے آپسی تعلقات کچھ اچھے نہیں تھے۔ قریبی رشتے داری تو ضرور تھی مگر کچھ وقت پہلے آپس میں کچھ دوریاں آ گئیں تھیں۔ اسی لئے یہ مشکل آ رہی تھی کہ بات آگے کون بڑھائے گا۔ اب جبکہ رضیہ کے گھر والوں نے بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تو سلیم کے گھر والوں نے ٹال مٹول کرنا شروع کر دیا۔ کہا ''کہ ہمارا بیٹا ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا ہے۔ پہلے بہنوں کی شادی کرونگا۔ پھر دو تین سالوں کے بعد شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔''

جب یہ بات سلیم نے سُنی کہ میرے والدین بہانے بنا رہے ہیں تو اُس نے اپنی ماں سے ناراضگی ظاہر کی۔ جس پر اُس کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''ہاں اب تو، تو خود مختار ہو گیا ہے۔ اپنے فیصلے خود کرنے لگا ہے۔ ماں باپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں ہے۔ مجھے گونگی اور بہرہ بنا کے چھوڑ دیا۔ میری محبتوں کی چھاؤں میں کہاں کمی رہ گئی جو تم ناراضگی کی دھوپ سے ہمیں جلا رہے ہو۔ ہم بھی تمہاری بھلائی ہی چاہتے ہیں۔''

''ماں ایسی بات نہیں ہے'' .... سلیم نے اپنی آواز میں زور دے کر کہا۔ ایسی بات نہیں ہے تو پھر کیا بات ہے'' ماں نے پوچھا۔

''ماں!۔ میرے کہنے کا مطلب ہے۔ رضیہ اچھی لڑکی ہے رشتے میں بھی ہم سب کی دوریاں جو اتنے سالوں کی ہے۔ وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ وہاں رشتہ ہو'' سلیم نے بہت نرمی اور عاجزی سے اپنی ماں کو سمجھایا۔

ماں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ ''تم کیوں میرا بلڈ پریشر بڑھا رہے ہو۔ تو کیا میری جان لے کر ہی دم لو گے۔ رضیہ کے بغیر جہاں بھی کہو گے میں تمہاری شادی کرنے کیلئے تیار ہوں۔ دیکھو کتنے اچھے اچھے رشتے آتے ہیں۔ کسی ایک کے لئے ہاں کہو۔ تمہارے ابا بھی خوش ہونگے۔ ماں نے اپنی زُباں پر زور دیا اور دانت چیر کر کہا۔

سلیم جھٹ سے بول پڑا۔ ''میں جہاں کہوں گا بس وہیں میری شادی ہوگی۔ بعد میں آپ کچھ نہیں کہو گے۔'' ''ہاں ہاں! بولو کہاں۔'' ماں نے پوچھا۔

''بس رضیہ سے'' سلیم یہ کہہ کر چُپ ہو گیا۔

''رضیہ ..... ہیں رضیہ! یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔'' وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہکا بکا رہ گئی۔ سوچنے لگی کہ ابھی ہم پرانی تلخیوں کو بھول نہیں پائے تھے۔ اب نئے سرے سے رشتہ اِس طرح جھوڑنا یہ صورتحال ہمارے لئے سخت پریشان کُن ہے۔

''مگر یہ رشتہ دو گھروں کا جوڑ بھی تو بن جائے گا۔ پرانی ساری تلخیاں ختم ہو جائیں گی

رشتہ بھی قریب آجائیگا۔ اتنا بھی تو سوچو۔ سلیم نے کہا۔

فوراً سلیم کی چاہت کو منظوری دینا بھی ایک ماں کے لئے محال تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کیا کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف بیٹے کی پسند و دِلچسپی اور دوسری طرف اپنے آپ کی آزمائش۔ یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والی بات ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سلیم کی ماں نے بیٹے سے کہا۔

''یہ کیسی شرط رکھی ہے سلیم تم نے۔''

''ماں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ کیا کمی ہے رضیہ میں۔ رشتے دار ہیں خاندان بھی اپنا ہے۔ نہ لڑکی دیکھنی ہے نہ شکل وصورت، سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ اب ہم دوسری لڑکی ڈھونڈنے کے لئے دَر دَر کی ٹھوکریں کیوں کھائیں گے۔'' سلیم نے کہا۔

بیٹے کا سوال ہے گھر کا اکلوتا چراغ، ماں باپ کی لاٹھی، دو دو بہنوں کا میکہ اور اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے ورنہ لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا کیونکہ اِس عمر میں پیار کا چسکا کسی قابل نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے ماں نے یہ سوچ کر ہاں کردی۔

اس طرح سلیم نے مطالبات کی وسعتوں سے اپنی بصیرتوں کی منزل کو پالیا اور گھر والوں نے بھی سلیم کی پختہ یقینی اور بالیدگی کا بخوبی اندازہ لگایا۔ اس خوشی میں سب گھر والوں نے خوشی میں مگن ہوکر صبح کا انتظار میں تمام رات لگ بھگ آنکھوں آنکھوں میں کاٹ لی۔ موذن کی پہلی صدا کے ساتھ یوں لگا کہ جیسے صدیوں بعد دِن نکل آیا ہو۔ اس خوبصورت احساس اور آمادگی کے ملن سے ایک خوشگوار خوشی جو کڑی دھوپ میں سائے کے لئے تڑپتی تھی۔ آج سالوں بعد دو معصوموں کے دلوں سے ہوتے ہوئے خشوع اور خضوع کے ساتھ کنارے لگ گئی اور پیچ کی تلخیاں، دوریاں، مجبوریاں جانے اور بھی کیا کیا ایک مدھم مدھم مسکراہٹ اور بڑوں کی سوجھ بوجھ ایک تازہ خوشبو کے ساتھ ختم ہوا اور رضیہ سلیم کی شادی کا پاک بندھن میں بندھ کر ایک نئ خوشبوؤں کے سفر کے ساتھ عمر بھر کے لئے شروع ہوا۔ کشتی منجدھار میں ہوتو

نظر دونوں کناروں پر رکھنا ضروری ہوتی ہے۔

برف کی ایک رات

ڈاکٹر ممتاز کوثر

شاید وہ اتوار تھا۔ موسم سرما تھا۔ سرما کی یہ صبح عجیب انداز میں پیغام دے رہی تھی۔ میں نے ٹی سٹال سے اُتر کر اپنے ڈیرے کی طرف تیز تیز قدم اُٹھانے شروع کئے۔

مسٹر .... او مسٹر

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن آواز دینے والے نے اپنا منہ دوسری جانب کر لیا تھا۔ میں نے آگے بڑھنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن آواز نے پھر میرا ---۔ کیا۔

مسٹر .... او مسٹر افضل

میں رک گیا۔ یار تم بھی عجیب آدمی ہو

کیا کالج کی سب زندہ دلی چھوڑ بیٹھے ہو۔

تم اپنی شرارت گلی کوچوں میں بھی نہیں چھوڑتے یہ وقت شرارت کا ہے

کیوں .... ؟ کیا بات ہے۔

ذرا آسمان کی طرف دیکھو۔ کیا کھائے جا رہا ہے۔

او! اس وجہ سے آپ پریشان ہیں۔

پریشانی یقینی ہونی ہی چاہئے۔ گھر کے سب افراد جموں چلے گئے ہیں۔ صرف میں ہی ایک بدنصیب ہوں جو ابھی ادھر ہی پڑا رہا ہے۔

پھر آپ کیوں نہیں گئے۔

.......کتنے سادہ بنے جارہے ہو۔کل ہی تو کالج بند ہوا۔

خیال ہے چھٹیاں جموں ہی میں گزارلونگا۔مگر........ مگر نگہت جان کا خیال جانے نہیں دیتا۔قادر نے ---مکمل کیا۔نہیں ایسی بات نہیں۔میرے سامنے روٹی کا مسئلہ ہے۔ آج تک کبھی خود پکائی نہیں۔اور اس ضمن میں تو میں بالکل ہیرو ہی ہوں۔نگہت جان کے پاس ڈھیرہ ڈال دینا نہ محبوبہ جو ٹھہری۔

قادر نے طنزاً کہا

وہ بڑی پروڑی ہے۔آپ کو یاد ہوگا کالج میں وہ ایک دفعہ کس قدر قہر آلود غصے سے ٹوٹ پڑی تھی۔ایسی لڑکیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔کتنی بار میں نے اظہار محبت کیا۔لیکن ہر بار ڈانٹ کے سوا کچھ نہ ملا۔آپ کے سامنے بھی کئی دفعہ منہ کی کھائی ہڑی۔پھر بھی ایسی لڑکی پر بھروسہ کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔

بس اتنی سی بات پر زندہ دلی جواب دے بیٹھی۔مایوس نہ ہو جائے اپنا کام زندہ دلی سے جاری رکھئے۔ہم تو زندہ دلی کیلئے کالج بھر میں مشہور ہیں۔کون ہے جو ہماری شرارت کی داد نہیں دیتا۔یہاں تک پروفیسر بھی ہماری شرارتوں سے مرغوب ہیں۔اور داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

موسم زیادہ خراب ہورہا تھا۔آسمان نے گرجنا شروع کیا۔یوں دکھائی دے رہا تھا ابھی برسے گا۔

نگہت جان کے ہاں جاؤ گے۔ضرور جاؤ روٹی پکانے کی زحمت سے بچ جاؤ گے نا........! وہ کیسے .... کس طرح سے جاسکتا ہوں۔اگر گیا بھی تو کیا پتہ ....وہ بڑی پروڈی ہے۔

میں ترکیب بتلاؤں گا........ ہمت سے کام لیجئے۔اچھا........بتاؤ تو سہی........ چلو آخری بار ہی سہی۔قسمت آزمائی ہی سہی

گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دروازہ پر دستک دینا شروع کی۔

کون ہے........ نگہت جان کی نقرائی آواز اندر سے آئی۔ دستک پھر ہو رہی تھی۔ نگہت جان پلنگ سے اُٹھی اور دروازہ کھولا کون ہے........ تم کون ہو۔

افضل جو سردی سے کہکہا رہا تھا۔ نحیف آواز میں بولا۔ میں فقیر ہوں۔ سائیں بابا ہوں۔ رات کیلئے جگہ دو۔

اچھا ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ میں ڈیڈی سے پوچھتی ہوں۔ وہ ڈیڈی کو پوچھنے چلی گئی۔

افضل خوف سے ٹھرا اُٹھا۔ اور شبہات کی دنیا میں کھو گیا۔

کیا نگہت نے پہچانا تو نہیں؟ چلو کچھ بھی ہو۔ یہ کھیل کھیلا جائے گا۔ چلے آؤ بابا........ نگہت کی آواز نے افضل کو گہرے خواب سے بیدار کیا۔

آباد رہو۔ خدا۔۔ لمبی عمر دے۔ جو ہم بوڑھے بابا لوگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ نہ جانے افضل کیا کیا فقیرانہ صدائیں۔ اور بلائیں دے رہا تھا۔

چلو بابا۔ اب چلو بھی۔!!

اچھا۔

بابا تم بہت ٹھٹھرا رہتے ہو۔

ہاں۔ سائیں لوگون کو بھی تو جان ہے۔ جان سب سے پیارا ہوا کرتی ہے۔

ایک تکلیف دے رہا ہوں۔

فرماؤ۔

کانگڑی ہے۔

ہاں لے لو۔ کانگڑی تو ہم لوگوں کا قومی نشان ہے۔

واقعی اس میں زندگی ہے۔ ہم گرم علاقے کے لوگ تو اسکے نام سے نا آشنا ہیں۔

اور کوئی حکم نگہت نے کہا

کتنے سادہ بنے جا رہے ہو۔کل ہی تو کالج بند ہوا۔

خیال ہے چھٹیاں جموں ہی میں گزار لونگا۔مگر........ مگر نگہت جان کا خیال جانے نہیں دیتا۔قادر نے۔۔۔مکمل کیا۔نہیں ایسی بات نہیں۔میرے سامنے روٹی کا مسئلہ ہے۔ آج تک کبھی خود پکائی نہیں۔اور اس ضمن میں تو میں بالکل ہیرو ہی ہوں۔نگہت جان کے پاس ڈھیرہ ڈال دینا نہ محبوبہ جو ٹھہری۔

قادر نے طنزاً کہا

وہ بڑی پروڑی ہے۔آپ کو یاد ہوگا کالج میں وہ ایک دفعہ کس قدر قہر آلود غصے سے ٹوٹ پڑی تھی۔ایسی لڑکیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔کتنی بار میں نے اظہار محبت کیا۔لیکن ہر بار ڈانٹ کے سوا کچھ نہ ملا۔آپ کے سامنے بھی کئی دفعہ منہ کی کھائی ہڑی۔پھر بھی ایسی لڑکی پر بھروسہ کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔

بس اتنی سی بات پر زندہ دلی جواب دے بیٹھی۔مایوس نہ ہو جائے اپنا کام زندہ دلی سے جاری رکھئے۔ہم تو زندہ دلی کیلیئے کالج بھر میں مشہور ہیں۔کون ہے جو ہماری شرارت کی داد نہیں دیتا۔یہاں تک پروفیسر بھی ہماری شرارتوں سے مرغوب ہیں۔اور داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

موسم زیادہ خراب ہو رہا تھا۔آسمان نے گرجنا شروع کیا۔یوں دکھائی دے رہا تھا ابھی برسے گا۔

نگہت جان کے ہاں جاؤ گے۔ضرور جاؤ روٹی پکانے کی زحمت سے بچ جاؤ گے نا........! وہ کیسے .... کس طرح سے جاسکتا ہوں۔اگر گیا بھی تو کیا پتہ ....وہ بڑی پروڈی ہے۔

میں ترکیب بتلاؤں گا........ہمت سے کام لیجئے۔اچھا........بتاؤ تو سہی........ چلو آخری بار ہی سہی۔قسمت آزمائی ہی سہی

گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دروازہ پر دستک دینا شروع کی۔

کون ہے........ نگہت جان کی نقرائی آواز اندر سے آئی۔ دستک پھر ہو رہی تھی۔

نگہت جان پلنگ سے اُٹھی اور دروازہ کھولا کون ہے........ تم کون ہو۔

افضل جو سردی سے کپکپا رہا تھا۔ نحیف آواز میں بولا۔ میں فقیر ہوں۔ سائیں بابا ہوں۔ رات کیلئے جگہ دو۔

اچھا ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ میں ڈیڈی سے پوچھتی ہوں۔ وہ ڈیڈی کو پوچھنے چلی گئی۔

افضل خوف سے ٹھرا اُٹھا۔ اور شبہات کی دنیا میں کھو گیا۔

کیا نگہت نے پہچانا تو نہیں؟ چلو کچھ بھی ہو۔ یہ کھیل کھیلا جائے گا۔ چلئے آؤ بابا........

نگہت کی آواز نے افضل کو گہرے خواب سے بیدار کیا۔

آباد رہو۔ خدا۔ لمبی عمر دے۔ جو ہم بوڑھے بابا لوگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ نہ جانے افضل کیا کیا فقیرانہ صدائیں۔ اور بلائیں دے رہا تھا۔

چلو بابا۔ اب چلو بھی۔!!

اچھا۔

بابا تم بہت ٹھٹھرا رہتے ہو۔

ہاں۔ سائیں لوگوں کو بھی تو جان ہے۔ جان سب سے پیارا ہوا کرتی ہے۔

ایک تکلیف دے رہا ہوں۔

فرماؤ۔

کانگڑی ہے۔

ہاں لے لو۔ کانگڑی تو ہم لوگوں کا قومی نشان ہے۔

واقعی اس میں زندگی ہے۔ ہم گرم علاقے کے لوگ تو اسکے نام سے نا آشنا ہیں۔

اور کوئی حکم نگہت نے کہا

جیتی رہو۔ جیتی رہو۔ بھگوان تجھے میڈیکل میں کامیاب کرے۔ بابا لپٹن چائی کا ایک کپ نوش فرمائیں۔

سائیں لوگ یہاں انکار کرتے ہیں۔ اسی لئے تو در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

چائے پی کر سائیں بابا نے آرام کرنا مناسب سمجھا۔ اور دلی مسرت سے دن بھر کی سب تھکاوٹ دور کر دی۔

نگہت جی آرام کرنے چلی گئی۔ اسے غیر ارادی طور پر سائیں بابا سے مانوسیت پیدا ہوگئی۔ سائیں بابا بڑے پہنچ میں معلوم ہوتے ہیں۔ میرا میڈیکل پروفیشن کا اسے کس طرح معلوم ہوا ہے۔ یہ لوگ روحانیت کے لوگ ہیں۔ ان کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ نا معلوم ۔۔۔ نے نگہت کو بے قرار کر دیا۔ وہ سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔

یہ رات طوفانی رات تھی۔ ایک طرف معصومیت تھی دوسری طرف شرارت تھی۔ اور ہر دو کے جھگڑے کا حل اسی رات پر منحصر تھا۔ تیز جھونکے چلنے شروع ہوئے۔ ہوا اور آندھیوں نے شور برپا کر دیا تھا۔ اور اس شور میں جداگانہ خیالات گم ہوگئے۔ برف پڑنی شروع ہوگئی۔ صبح برف پوش زمین ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔

بابا! میں تمہیں چند پرشن پوچھنا چاہتی ہوں۔ فرماؤ۔ سائین لوگوں کا تو ہی کام ہے۔ تمام عمر اسی فن میں گزری ہے۔ یہ کام کرتے کرتے سر کے بال بھی سفید ہوگئے ہیں۔

آؤ نزدیک بیٹھ جاؤ۔

تمہارا نام ....

آپ ہی بتائیں۔

سائیں بابا کا مذاق نہ اڑاؤ۔ سائیں بابا کا امتحان نہ لو۔ وہ بہت کچھ جان سکتا ہے۔ اُسکے پاس علم کی ہی شکتی ہوتی ہے۔ بابا کے علم کی شکتی اتنی ہے تو وہ خود ہی کیوں نہ بتائیں۔

دیکھ لو۔ یاد رکھو سائیں بابا اگر سچ کہتا ہے تو اُسکی صداقت کو اُسکی سچائی کو جھٹلائینگے نہیں

نا۔

وعدہ ہے۔ جھٹلاؤں گی نہیں (نگہت نے کہا)

وعدہ ہے۔

وعدہ ہے۔

سائیں بابا چند زائچہ بناتا ہے۔ غور سے زائچہ کا ملاحظہ کرتا ہے۔ تمہارا نام نگہت جان ہے۔

ٹھیک ہے۔

تم لاسٹ ایر میڈیکل میں پڑھ رہی ہو۔

یہ بھی ٹھیک ہے۔

اور تمہاری شادی عنقریب ہورہی ہے۔

کس کے ساتھ۔

یہ بھی بتلادونگا۔ مگر بتلاؤنگا نہیں۔ تمہاری مرضی کے خلاف سب کچھ ہوگا۔

ایسا نہیں ہوگا۔ میری مرضی کے خلاف نہ ہوگا۔

تم اپنی مرضی سے کروگی تو پشتاؤگی اگر ماں باپ کی مرضی شامل حال نہ ہوگی۔

میں اُن کو راضی کرلونگی۔

بابا اس کام میں تمہاری مدد کرسکتا ہے۔ وہ جنتر منتر سے سب کچھ پلٹ سکتا ہے۔

زندہ رہو بابا ایسا ہی کرو۔

دیکھو تم لومیرج (Love Marriage) کرنا چاہتی ہو۔

ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔

میرا تجربہ ہے۔ لومیرج کامیاب نہیں رہتی ہے۔ ایک دو سال مسرت کے گزر جاتے ہیں۔ لیکن پھر زندگی وبال جان بن جاتی ہے۔ دنیا کے سب دُکھ درد سمٹ کر آتے ہیں۔ اور

گھر بجائے جنت کے جہنم بن جاتا ہے۔
کچھ بھی ہو۔ میں اپنی آرزوں کا مول اپنی آرزوں کے مطابق تعمیر کرنا چاہتی ہوں۔
میں اپنے ہاتھوں مجبور ہوں۔ کبھی آئیندہ واقعات کو ناخوشگوار نہ بننے دونگی۔
وعدہ ہے۔
مکمل وعدہ ہے۔
اچھا۔ یہ بتاؤ وہ خوش نصیب کون ہے۔
بابا تم کو یہ بھی معلوم ہی ہوگا۔
میں کیا بتاؤں۔
ضرور بنتا ہے۔
اصرار نہ کرو۔
میں اصرار کرتی ہوں نگہت کو اب سائیں بابا پر پورا اعتماد بھروسہ ہو چکا تھا۔
سائیں بابا کو تم تنگ کرتی ہو۔
اتنے میں قادر داخل ہوتا ہے۔ گفتگو ہو جاتی ہے۔
آؤ بیٹا۔ بیٹھو۔
سائیں بابا۔ میرا ہاتھ دیکھ کر میری قسمت بتلاؤ۔ لاؤ ہاتھ۔
تمہارے بھاگ اچھے ہیں۔ دھن۔ دولت اور بیوی کا سکھ ملے گا بیٹا۔ اپنے دوستوں سے ہوشیار رہنا جو تیرا دوست ہے۔ وہی تیرا دشمن ہے۔ بیٹا کسی کو منہ پر۔۔۔ تھپڑ نہ لگایا کرو۔ تم جس سے عشق کرتے ہو اس میں کامیاب نہ ہونگے بیٹا۔ وہ زہریلی ناگن ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچائیگی۔
تمہارے بھاگ میں اونچی تعلیم لکھی ہے۔
تعلیم کا آخری سال ہے۔ کامیاب ہو جاؤ گے بیٹا۔

سرکاری آٹا کھانا بھی تمہاری قسمت ہے۔ اچھا اُٹھو جاؤ محنت کرو۔ والدین کی خدمت کرنا۔

سلام بابا۔ سلام

اسکو معلوم ہی نہیں کہ بابا کون ہے۔ بابا لوگوں کی کوئی ذات نہیں۔ اُن کی ذات انسانیت ہے۔

انسانیت اور کچھ نہیں۔

بابا نام لکھتا ہے۔

۱۔ شوکت علی۔

۲۔ علی جان۔

۳۔ قادر۔

۴۔ رفیع الدین۔

۵۔ افضل۔

نگہت ان میں سے کون ایک وہ خوش نصیب ہے۔ نگہت چند لمحہ کیلئے مبہوت ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ سب کے سب اُسکے کلاس فیلو (class fellow) تھے۔

کون ہے۔ بتلاتی کیوں نہیں۔

نمبر ۵۔ نگہت نے کہا۔

کیا نام ہے اسکا۔

افضل۔ چند ملے جلے شرمیلے تاثرات کے زیر اثر نگہت نے کہا۔

لکھ دو تم اسکی کیا بن کر رہو گی۔

بیوی

اور

خادمہ

اور

افضل کے چرنون کی دھول بن کر رہونگی۔

یہ تم عورت کے روپ میں کہہ رہی ہو۔

نہیں۔

انسانیت کی لگن کے روپ میں کہہ رہی ہوں۔

تم اسکو چاہتی ہو۔ اگر وہ تمہیں نہیں چاہتا ہے تو تم کیا کروگی۔

''خودکشی''

خودکشی کرنا بزدلی کا دوسرا نام ہے۔

اگر افضل خودکشی کرڈالے۔ تو۔

بابا ایسی بات نہ کہو۔ اُسکے متعلق ایسی بات سننا میں گوارا نہیں کرسکتی۔

تم نے اس کو بہت دکھ دیا ہے۔ وہ تمہیں پروڈ کی کہتا ہے۔ اُسکا کہنا سچ ہے۔ لیکن شد عام میں اُسکو کیسے کہتی کہ نگہت تم پر ہزار جان قربان ہے۔ اگر اسکو کبھی دھڑک جھڑک دی تو کسی خاص مصلحت کی بنا پر دی ہوگی۔

تو اس سے معافی مانگ لینا۔ وہ تم سے مایوس ہے۔

معافی مانگ لونگی۔ اس کو حاصل کرنے کیلئے میں کچھ بھی کرلونگی۔

یہ لو جنتر منتر آپ کی لکھی ہوئی رائے افضل نے معلق میرے پاس رہے گی۔

رکھ لو بابا۔

اچھا! اب بابا کو اجازت دے دو۔

یہ کہتے ہوئے بابا نے اپنا چغہ درست کیا۔

نگہت چلو مجھے راستہ پر ڈال دو۔

بابا آج ادھر ہی رہو۔

میں بابا لوگ ایک ہی جگہ نہیں ٹھہرتے۔

اچھا آپکی مرضی۔نگہت نے کہا۔

آدھ میل تک نگہت بابا کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

آخر بابا پلٹ کر مڑا۔اُس وقت اُسکی مصنوعی داڑھی کا قلع قمع ہو چکا تھا۔

تم گھر چلی جاؤ۔

تم۔افضل۔شیریر۔

۔۔۔۔مسرت سے نگہت نے افضل پر برف کے گولے پھینکنے شروع کئے۔ برف کی ایک ہی رات نے اُسکا سب پروڈ خاک میں ملا دیا۔

سب طلبا کلاس میں بیٹھے تھے۔کہ افضل داخل ہوا۔ادھر آؤ بابا قادر نے کہا۔

اور نگہت منہ پر کتاب رکھے مسکرا رہی تھی۔

خواہشوں کا احترام

واجدہ تبسم گورکھو

سیفؔ نے اپنے لئے ہر سامان مُیسر رکھا تھا۔ وہ اپنے جذبات کو اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں بانٹتا تھا۔ اور اپنے ذوق کے لئے اپنی بیوی زریںؔ کے ساتھ خلافِ معمول زیادہ ہی پیار و محبت سے پیش آتا تھا۔ اُس کی بیوی اپنے شوہر سیفؔ کے سب کارنامے جانتی تھی۔ اس لئے وہ سب کچھ برداشت کر کے بہت ہی کڑوے گھونٹ اپنے بچوں کی خاطر پیتی تھی۔ اور کبھی کبھار اپنے بدصورت ہونے پر خون کے آنسو بھی بہاتی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کی دولت کا کبھی ضرور نہیں کیا۔ حالانہ اُس کا باپ اپنے شہر کا جانا مانا تاجر تھا۔ اور اُس نے اپنی بیٹی کو جہیز میں بہت کچھ دے رکھا تھا۔ سیفؔ شام کو گھر آتا تھا۔ اُس کا باپ اپنے شہر کا جانا مانا تاجر تھا۔ اور اُس نے اپنی بیٹی کو جہیز میں بہت کچھ دے رکھا تھا۔ سیفؔ شام کو گھر آتا تھا۔ اُس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ سیفؔ کی ہر بات کو ہر کالے کرتوت کو نظر انداز کرتی تھی۔ بازاوقات کوئی اُسے سیفؔ کے بارے میں کچھ کہتا تھا۔ وہ سنتی تو ضرور تھی۔ مگر کہتی صرف اتنا تھی۔

"مرد تو آخر مرد ہی ہوتا ہے۔ خاص کر سیفؔ جیسے مرد، وہ تو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے۔ اور درندگی اُس کی فطرت میں شامل ہے۔ اگر میں اُس سے کچھ کہوں، روکوں، ٹوکوں، اُس پر نظر رکھوں یا پھر اپنا منہ کھولوں، تو میں اُس کے اس پیار و محبت سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔ جو وہ گھر آنے پر مجھ سے بے دلی سے ہی سہی، جتنا تا تو ہے۔ کم سے کم اُس کے دل میں یہ خوف ہے۔ کہ شاید، میری بیوی کو میرے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے وہ بچوں کی فکر تو کرتا ہے۔ جب تک اُس کی جوانی کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ اُس کو میں کیا، کوئی بھی رُوک نہیں سکتا ہے۔ اِس لئے میں اپنی زبان بند رکھتی ہوں۔ وہ مجھے بیوقوف اور گنوار سمجھتا ہے۔ وہی سہی، میں

جانتی ہوں۔ جب اُس کے ذوق کا ذائقہ پھیکا پڑے گا، تو وہ لوٹ کر میرے پاس ہی آئے گا۔"

اور ایک دن ایسا ہی ہوا۔ سیفؔ کی ایک پرانی شناسائی لڑکی شاہدؔ سیفؔ سے ملنے آئی۔ وہ اُس وقت اپنے گھر کے لان میں سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھا تھا۔ شاہدہؔ کی سحر انگیز منفرد آواز نے اُسے اپنی طرف راغب کیا۔ اور سیف ایکدم سے بول پڑا۔

"کیس ہو شاہدہؔ!"

پہلے تو وہ چند لمحات کے لئے شش و پنج میں پڑ گیا۔ کیونکہ وہ اُس کی سحر انگیز آواز میں ڈوب گیا۔ اور اُس کے بے ڈُول جسم، نیم عریاں بدن کے بے انتہا اشتیاق سے دیکھنے لگا۔

کیونکہ سیفؔ کی نظروں کے سامنے شاہدہ کا وہ پہلا والا شعلہ بھڑکتا ہوا پیکر اُبھرا۔ وہ اُس کی بڑی بڑی شوخ و چنچل کاجل سے بھری بھری آنکھیں، تراشا ہوا گداز جسم، پتلی کمر اور بات بات پر ہنستا کھیلتا چہرہ گھومنے لگا۔ کیا خوبصورت چہرہ تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ جس کے ساتھ میں نے بہت ہی حسین اور رنگین راتیں گذاری تھیں۔ آج اُس کا وہ حسین چہرہ بالکل سُکڑ گیا ہے۔ اور اُس کا سنڈول جسم بے ڈُول ہو گیا ہے۔ وہ جوانی کا بھڑکتا شعلہ ہی بُجھ گیا ہے۔ وہ شکل و شباہت بالکل ہی نہیں رہی ہے۔ یہ ضعیف اور لاغر عورت ضرور لگ رہی ہے۔ مگر آواز میں برابر کی لچک ہے۔

اتنے میں سیفؔ کی بیوی باہر لان میں آ گئی۔ دونوں سیفؔ اور شاہدہؔ اُس کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ اور کچھ دیر کے لئے دونوں پر سکوت کا عالم طاری رہا۔ سیفؔ کی بیوی سمجھ گئی۔ کہ دال میں کچھ کچھ کالا ہی نہیں، بلکہ پوری دال کالی ہے۔ سیفؔ نے جلدی سے شاہدہ کا تعارف اپنی بیوی سے کرانا چاہا۔ مگر بیوی زرتیح جلدی بول پڑی، اس سے پہلے کہ سیف کچھ کہتا۔

"میں آپ کے ایسے مہمانوں کا کب تک خاطر تواضع کروں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی آٹپکتا ہے۔ اس عمر میں بھی آپ کا پیچھا ان سے نہیں چھوٹتا ہے۔" شاہدہ کو سیفؔ کے سامنے

یہ سن کر کچھ عجیب سا لگا۔ شرمندگی کی حالت میں وہ کچھ نہ بول پائی۔ اور رسمی ملاقات کے بعد وہ ہاں سے نکل گئی۔

سیفؔ کی بیوی زرینؔ نے کچھ قدم جما کر اور اپنے دل میں ہمت جُٹھا (اگر آج نہیں تو پھر کبھی نہیں) سیفؔ سے کہا۔ ''ہوش سے کام لو۔ پاگل مت بنو۔ اب یہ سب کچھ اس عمر میں آپ کو زیب نہیں دیتا ہے۔ یہ سب چلتا رہے گا۔ تو بچوں کی زندگی سے کھلواڑ ہوگا۔ میری عمر جس تناؤ میں گذری تو گذری۔ اب بچوں کی سمجھ میں سب کچھ آرہا ہے۔ کل کو اگر وہ بھی آپ کی طرح آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلنے لگیں گے۔ تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' یہ سب کہہ کر آج زرینؔ اپنے آپ کو کچھ ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ شاید وہ سکون کی نیند بھی سوئے گی۔ کیونکہ اُس نے آج سیفؔ کو اُس کی غلطیوں کا احساس دلایا تھا۔

سیفؔ آج بہت ہی بسی سے زرینؔ کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ماضی کے سمندر میں ڈُبکیاں لگا رہا تھا۔ یا شاید اپنے گناہوں کی گنتی بھی گن رہا تھا۔ زندگی نے سیفؔ کو عجیب دُوراہے پر لا کھڑا کیا تھا، پچھلا کیا ہوا حساب مانگ رہا تھا۔ اور اگلا وہ اب خود جینا نہیں چاہتا تھا۔ مگر! وہ لاچار اور بے بس بالکل نہیں تھا۔ وہ اسلئے کہ بیوی نے اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اور اُس کی خواہشوں کا ہر پل احترام کیا تھا۔

وہ شرمندگی کے ساتھ اُٹھا۔ اور زرینؔ کو گلے لگایا۔ دونوں میاں بیوی لان سے نکل کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر ایک ساتھ آ گئے۔ آج اُس کی بیوی زرینؔ اپنے سیفؔ کیلئے کسی حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

دردِ دل کے واسطے

شبنم بنت رشید

فرشتہ کو بہت پہلے بچپن میں رشتوں کی چاہت، محبت، الفت، رفاقت اور ہمدردی سمجھ بھی آئی تھی اور نظر بھی آئی تھی جب اس نے اپنے ماں باپ کو بیگانہ بنتے دیکھا۔ اس کے ماں باپ جاہل، غیر ذمہ دار، ناسمجھ اور چڑ چڑے تھے۔ ایک دوسرے کے دل میں جگہ نہ بنا پائے تو الگ الگ ہوئے۔ انہیں فرشتہ کی ولادت سے کوئی فرق نہ پڑا۔ معصوم فرشتہ بے رحم حالت کا شکار ہوگئی۔

یہ فرشتہ کی خوش نصیبی تھی کہ خالہ نے اسے گود لے کر رشتوں کے احساس اور جذبے کو بر قرار رکھا۔ اسے فرشتہ شروع سے ہی بے حد عزیز تھی۔ خالہ بیوہ اور بے اولاد تھی لیکن آسودہ حال اور دل کی وسیع خاتون تھی۔ خالہ بھر پور توجہ اور محبت سے فرشتہ کی پرورش کے ساتھ ساتھ اس کے تعلیمی اخراجات بھی پورے کرتی رہی۔ فرشتہ ذہین اور تابعدار بچی تھی۔ ذہین بچوں کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ لہٰذا فرشتہ کی تعلیمی کارکردگی قابل تعریف تھی۔ اس نے امتیازی نمبر حاصل کر کے گورنمنٹ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ ٹریننگ مکمل ہوئی تو اس کی پوسٹنگ شہر کے ایک مشہور سول ہسپتال میں ہوگئی۔

فرشتہ کئی سالوں سے اس ہسپتال میں تعینات تھی۔ پُر اعتماد، خداترس اور ملنسار لڑکی تو پہلے سے تھی لیکن اب ہمدردی، خلوص اور ذمہ داری اس کا پیشہ بن گیا۔

اپنا محاسبہ کیے بغیر کچھ لوگ ڈاکٹروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا دل ہر جذبے اور ہر احساس سے خالی ہوتا ہے اور ان کے پاس فرصت کے لمحات کم ہی میسر ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ڈاکٹروں کو نوٹ چھاپنے کی مشین بھی کہتے ہیں لیکن اکثر لوگ ڈاکٹر کو مسیحا کا درجہ دیتے

ہیں۔

اس مختصر سی زندگی میں فرشتہ کا بیماریوں، حادثوں، زندگی، موت، ہمدردی، خلوص اور انسانیت سے بھرپور تعارف ہوا۔ اس نے زندگی اور موت کو قریب سے دیکھا۔ معجزے بھی دیکھے اور دعاؤں کا اثر بھی دیکھ لیا۔

اپنے ماں باپ کی طرف سے ٹھکرائی ہوئی لڑکی فرشتہ کا دل رحم سے لبریز تھا۔ اس کی اپنی الجھنیں تھیں، اپنے مسئلے تھے۔ اس کے باوجود علاج معالجہ کے ساتھ ساتھ، وہ مریضوں سے بہتر سے بہترین انداز میں پیش آتی تھی۔ مصروف ترین زندگی ہونے کے باوجود وہ غریب مفلس اور نادار مریضوں کی ہمدردی کرتی رہی۔ ان کے قریب رہ کر اس کے دل کو سکون ملتا تھا۔ وہ دھن دولت کی پُجارن نہ تھی بلکہ ایک مخلص انسان تھی۔ وہ اپنی خوبیوں اور نیک طبیعت کی وجہ سے پورے ہسپتال میں ایک رحم دل شہزادی کی طرح مشہور ہوگئی۔

اپنے ہسپتال میں فرشتہ کا تعارف ایک ایسے نوجوان مریض سے ہوا جو آنکھیں موندے بستر مرگ پر اپنی سانسیں گن رہا تھا۔ اس کے بدن پر بے شمار چھوٹے بڑے رِستے زخموں کے علاوہ بے شمار ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں گمان ہوتا تھا کہ شاید مر گیا ہے۔ اس کے بدن کی تباہ کن حالت دیکھ کر فرشتہ کو اس کی تیمارداری میں مصروف اس کی بیوی کے ساتھ دلی ہمدردی ہوئی۔ اپنے شوہر اور پانچ سالہ بیٹے کے سوا حیا کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ فیض اپنی امی کے ساتھ سہما سہما رہتا تھا۔ بغیر کسی رشتہ کے ایک انجانا سا احساس تھا۔ شاید اسی لئے فرشتہ حیا کے ساتھ ایک مہربان سایہ کی طرح رہنے لگی۔ ادویات لانی ہوں، ٹیسٹ کرانا ہو یا ان کی رپورٹ لانی ہو یا کوئی ضرورت فرشتہ ان کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتی تھی۔ ڈیوٹی پر آتے وقت فرشتہ ہمیشہ فیض کے لئے اپنی جیب میں کبھی ٹافی کبھی بسکٹ کبھی چاکلیٹ تو کبھی جام کے پیکٹ لاتی تھی۔

حیا کا بزرگ سسر علی محمد اہل ہنر تھا جو کسی زمانے میں اپنے باپ دادا کے ساتھ کسی گاؤں

سے روزی روٹی کی تلاش میں شہر آیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لکڑی تراشنے اور اس میں جان ڈالنے کا ہنر تھا۔ بچپن سے شہر کے ایک مشہور کارخانے میں معمولی اجرت پر کام کرتا تھا۔ اب کائنات نے اکلوتی اولاد سے نوازا تھا۔ آصف علی صرف چار سال کا تھا جب ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ علی محمد نے اپنے بیٹے کو آٹھویں درجے تک پڑھایا پھر اسکول سے اٹھا کر سیدھے اپنے ساتھ کارخانے میں کام پر لگایا۔ رفتہ رفتہ آصف علی بھی لکڑی تراشنے میں ماہر ہو گیا۔ مختصر سا گھر تھا۔ قلیل آمدنی تھی۔ مشکلات کا سامنا کرتے کرتے باپ بیٹا خودداری اور سادگی کی زندگی جی رہے تھے۔

آصف علی نے جوانی میں قدم رکھا تو علی محمد نے اس کا عقد حیا سے کر دیا۔ حیا یتیم خانے میں پلی بڑھی ایک باحیا اور صابر لڑکی تھی۔ حیا نے گھر میں قدم رکھا تو گھر میں جیسے ہر طرف بہاروں نے اپنا ڈیرہ ڈال دیا۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی اتنی خوبصورت بھی ہوتی ہے۔ حیا محبت کرنے والی بیوی اور خیال رکھنے والی بہو ثابت ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد آصف علی اور حیا کے گلشن حیات میں ایک ننھا پھول کھلا۔ فیض کی ولادت سے علی محمد کے گھر کی خاموشی رخصت ہو گئی۔ انکی بے رونق زندگی کو ایک نیا مقصد مل گیا اور وہ لاڈلے فیض کے سنہرے مستقبل کے خواب دیکھنے لگے۔ اب وہ زندگی کی نئی شاہ راہ پر گامزن ہو گئے۔ وہ دن رات سخت محنت کرنے لگے۔ نہ جانے ہنستے بستے اور پرسکون شہر کو کس کی نظر لگ گئی۔ مشکل دنوں اور بے چین راتوں کا آغاز ہوا۔ سرکار نے شہر میں سڑکوں کو وسعت دینے کے لیے سڑکوں کے دونوں اطراف تعمیرات ہٹانے کا حکم جاری کر دیا۔ پورے شہر میں بے چینی پھیل گئی۔ اکثر لوگوں کو بے روزگاری کا اندیشہ تھا اور بہت سارے لوگ بے گھر ہونے والے تھے۔ اس زد میں علی محمد اور اس کے بیٹھے کے مالک کا کارخانہ بھی آیا۔ شہر میں بے چینی پھیلتے ہی دکانوں کے شٹر گر گئے۔ کارخانے بند ہوئے۔ ہر روز ہڑتال اور احتجاجی مظاہروں پر لاٹھی چارج کے بعد کرفیو۔

نامساعد حالات نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جانے سڑکوں کو وسعت دینا لوگوں کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی۔ پورے شہر کو ہڑتال اور کرفیو کا روگ لگ گیا۔ کرفیو ہو یا ہڑتال عام انسان کے لئے ہزاروں دکھ اور مصیبتیں ساتھ لاتا ہے۔ عام انسان اور مزدور پیشہ شخص بیروزگاری کا شکار ہوتے گئے۔ بیروزگاری انسان کو بڑی بڑی آزمائشوں میں مبتلا کرتی ہے۔ بیروزگاری بڑے بڑے دکھوں اور مسائل کو جنم دیتی ہے۔

ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود علی محمد کی ایک مخصوص عادت تھی کہ وہ گھر میں کئی کئی مہینوں کے لئے راشن جمع رکھتا تھا۔ حالات روز بروز خراب ہوتے گئے۔ بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ عرصہ تو آرام سے گزرا۔ مگر گھر میں جتنا راشن، رزق یا نقد پیسہ موجود تھا، آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ ننھا مہمان ابھی صرف ماں کا دودھ پی رہا تھا اور ماشاء اللہ تندرست بھی تھا ورنہ پریشانی میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ علی محمد کے کارخانے کے مالک نے حالات خراب ہوتے ہی تمام کریگروں کو بلا کر ان کا حساب بے باق کر کے اپنا کارخانہ بند کر دیا اور خود کہیں باہر چلا گیا۔ علی محمد کو جو ایک مدہم سی امید تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ ناامید ہوتے ہی علی محمد اپنے اندر کمزوری محسوس کرنے لگا۔ غم روزگار، فکر فاقہ اور وقت پر دوا اور مناسب غذا نہ ملنے کی وجہ سے علی محمد اندر ہی اندر سے ٹوٹ کر بستر نشین ہوگیا۔ کئی لوگوں کے پاس گھروں میں اپنی تجوریاں مال سے بھری پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کے پاس بنکوں میں لاکھوں کی رقم موجود تھی۔ لیکن خودداری سے جینے والے علی محمد اور اس کے بیٹے نے کسی کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس دنیا میں ہر آسودہ حال انسان اپنی ضروریات کے ساتھ ساتھ آس پڑوس میں رہنے والے کسی سفید پوش محتاج پر نظر رکھ کر وقت وقت پر اس کی حاجت روائی کر کے اللہ کی رحمت کا حصہ دار بن کر اپنے لئے جنت کما سکتا ہے۔

اپنے دکھوں اور تکلیفوں کو چھپا کر علی محمد نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ اب اس شہر بے درد سے کہیں اور چلا جائے۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے، تمہیں کہیں نہ کہیں روزگار ملے گا۔ محنت کی روٹی

کما کر اپنے اہل وعیال کو کھلانا۔ اس میں سکون اور بڑی برکت ہوتی ہے۔ حالات سدھرتے ہی گھر لوٹ آنا۔ انشاء اللہ اچھا وقت بھی ضرور آئے گا۔ اپنے بیٹے کو امید کے چراغ تھماتے تھماتے اور دعا دیتے دیتے ناتواں اور بے بس علی محمد مزید دکھوں اور تکلیفوں کو جھیل نہ پایا۔

بزرگ والد کا سایہ سر سے اٹھتے ہی پریشانی اور بدحالی میں مزید اضافہ ہوا آصف علی کا دل اپنا گھر اپنا شہر چھوڑنے کے لئے راضی نہ تھا کیونکہ اس کو اپنے گھر سے اپنے شہر سے، اس کی گلیوں سے بے پناہ محبت تھی۔ بے شمار یادیں وابستہ تھیں ہے ایک ساتھ۔ انتہائی مجبور ہو کر ایک دن اپنے گھر کو تالا لگا کر اپنی جان اور اپنے اہل عیال کی جان ہتھیلی پر رکھ کر شہرے سے دور بہت دور یمبر زل وادی کے ایک سرسبز علاقے میں پہنچ گیا۔ خوبصورت جنگل کے دامن میں آباد علاقہ، اس دور دور تک ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ صاف وشفاف ندیاں زرخیز زمین کو سیراب کر رہی تھیں اور ہر گھر میں موجود مال مویشی موجود تھے جن بدولت گھروں میں دودھ کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف اقسام کے پھل پیدا کرنے والے تھے۔ بڑے بڑے بے شمار باغات جن کی بدولت یہاں کی اکثر آبادی آسودہ حال بے فکری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ مکانات بھی پکے اور بہترین، جن میں گزر بسر کرنے والے دیندار اور اچھے لوگ، جیسے جنت کا نظارہ تھا۔ یہاں پہنچ کر آصف علی کی ملاقات سید صاحب سے ہوئی۔ جو اس آسودہ حال علاقے کے ایک بہترین انسان اور کامیاب تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ کئی باغ بغیچوں کے مالک تھے۔ آصف علی کے حالات سے واقف ہو کر انہوں نے اس کو اپنے یہاں ملازم رکھا۔ تنخواہ مناسب مقرر کر کے سب سے پہلے اسے رہنے کے لئے گھر فراہم کیا۔ اس کے علاوہ دودھ سبزی اور چاول بھی سید صاحب کی طرف سے آنے لگے۔ آصف علی نیک نیتی اور ایمانداری سے سید صاحب کے کاروبار کی رکھوالی کرنے لگا۔ دلکش اور پرکشش نظاروں کے بیچ ان کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ موسم بھی بدلتے رہے اور وقت اچھا گزرنے لگا۔

ہر سماج میں اچھے لوگوں کے ساتھ بُرے لوگ بھی ہوتے ہیں اور مال وزر کے لالچ میں

کچھ بھی کر بیٹھتے ہیں۔ کچھ خود غرض اور غیر ذمہ داروں لوگوں کی مہربانی سے جنگلوں کا بے تحاشہ کٹاؤ ہوا تھا اور اس سے ماحول کو جو نقصان پہنچا، اس کا خمیازہ عالمی سطح پر انسانیت کو تا دور قیامت بھگتنا ہے۔

ایک انتہائی بدنصیب صبح آصف علی ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی سائیکل پر سوار ہو کر باغ کی طرف روانہ ہوا۔ جوں ہی وہ باغ کے اندر داخل ہوا تو گھات لگائے بیٹھے ایک آوارہ بھوکے درندے نے اس پر حملہ کیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر جب تک لوگ اس کو بچانے پہنچ گئے تب تک اس کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ بس سانسیں چل رہی تھیں۔ فوری طور پر اسے شہر پہنچایا گیا۔ یہاں اسے کئی جراحیوں سے گزرنا پڑا۔ خون بھی کافی بہہ چکا تھا۔ یہاں پر مختصر تعارف ہوتے ہی فرشتہ ان کی مدد کرنے لگی۔ سید صاحب نے بھی بھرپور مدد کی۔ فلاحی ادارے بھی سامنے آئے مگر آصف علی صحت یاب نہ ہو سکا بلکہ انفیکشن روز بروز اس کے جسم کے اندر پھیلتا گیا۔ وقت دھیمی رفتار سے گزارنے لگا۔ ساتھ ساتھ مہنگی دوائیوں کی فہرست بھی بڑھتی گئی۔ مدد کرنے والوں نے آہستہ آہستہ ہاتھ کھینچنے شروع کر دیئے۔ حیا بے یار و مددگار رہ گئی۔ انتہائی مجبور ہو کر اس نے اپنے شریک حیات کی سانسیں خریدنے کے لیے اپنے آشیانے کا سودا کیا۔ وہ دوائیاں خریدتی رہی لیکن آصف کی حالت دن ہ دن بگڑتی رہی۔ اس کے پاس موجودہ رقم بھی ختم ہونے لگی لیکن آصف علی ذرا بھی شفایاب نہ ہوا۔ شاید دعا اور دوا دونوں بے اثر ہو چکے تھے۔

آج صبح فرشتہ ڈیوٹی پر پہنچی تو وارڈ میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر آصف کے خالی بیڈ پر پڑھتے ہی وہ دنگ رہ گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ کل رات ہی کو آصف زندگی کی جنگ ہار گیا اور طویل اور اذیت ناک آزمائش سے گزرنے والی حیا اپنے شوہر کے بے جان جسم کو لے کر صبح سویرے جا چکی ہے۔ کس طرف گئی اور کدھر گئی، کسی کو معلوم نہیں۔ کچھ دیر فرشتہ مجسمے کی طرح وہیں کھڑی رہی، پھر بجھے بجھے دل کے ساتھ دن بھر اپنا فرض نبھاتی رہی۔ بہت سارے دن

یوں ہی گزر گئے جیسے صدیاں بیت گئیں لیکن فرشتہ کو حیا کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلی۔

آج شام پانچ بجے فرشتہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ہسپتال کی عمارت سے باہر نکلی تو ہاتھ میں اسٹیسکوپ اور بازو پر اپنا ایپرن اور پرس سنبھالے ہوئے مین گیٹ کے نزدیک پہنچی تو لوگوں کی بھیڑ میں کسی بچے نے پیچھے سے آواز دی: ڈاکٹر دیدی ڈاکٹر دیدی۔ فرشتہ نے مڑ کر دیکھا سامنے فیض کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ سکے اور دس روپے کا نوٹ تھا۔ اس ننھے شہزادہ کی حالت قابل رحم تھی اور اس کے معصوم سراپا سے بیچارگی عیاں تھی، جیسے اپنا بچپن نہیں گروی رکھ کے آیا ہو۔ فرشتہ نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا امی کہاں ہے۔ فیض نے دیوار کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا تو وہ فرشتہ اس کی انگلی پکڑ کے تیز تیز قدم اٹھا کر حیا کے پاس پہنچ گئی۔

حیا نے اپنے وجود کو سیاہ برقع میں سمیٹ لیا تھا اور اس کو دیکھ کر اس نے اپنا نقاب اٹھایا۔ فرشہ حیا کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ فیض بھی اپنی امی کے بغل میں چپک کر بیٹھ گیا۔

فرشتہ نے حیا سے پوچھا اتنے دنوں سے کہاں رہ رہے ہیں آپ لوگ۔ خاموشی سے آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کتنے پل یوں ہی گزر گئے۔ پھر حیا نے اپنے آپ کو سنبھالا اور تفصیل سے اپنی داستان سنانے لگی۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اوپر یہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہے۔ وہ میرے لئے قیامت کا دن تھا جب میں آصف کے بے جان جسم کو لے کر اپنے پرانے محلے میں گئی۔ محلے والوں نے اس کو غسل دیا، دفنایا، تعزیت کو آئے ہوئے لوگوں کے لیے ٹھہرنے کا انتظام کیا، ہم ماں بیٹے کو کھلایا پلایا۔ ہمارا خیال رکھا، ڈھارس بندھائی لیکن جس گھر میں ہمیں ٹھہرایا گیا اس گھر کا مالک چرب زبان تھا۔ حقیقت میں نہایت ہی گھٹیا قسم کا شخص تھا۔ مشکل سے اپنا دامن بچا کر وہاں سے نکل کر آئی ہوں۔ ایک عورت کتنی با کردار اور بہادر کیوں نہ ہو، ایک مرد کے سائے کے بغیر بے دقعت اور کمزور ہوتی ہے۔ مجھ جیسی بے بس عورت، جس کا کوئی اپنا نہیں، کوئی ٹھکانا نہیں، وہاں سے نکل کر کہاں جاتی۔ کہاں اپنا پڑاو ڈال

سکتی تھی۔ لیکن مشکل کو آسان کرنے والا سب کو راہ دکھانے والا پروردگار ہے۔ وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ جب میں وہاں سے نکلی تو میرے دل میں اس گھر کا خیال آیا، جو کسی کی جاگیر نہیں۔ جہاں کبھی روشنی گل نہیں ہوتی۔ جس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ جہاں آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی ڈر نہیں۔ اس گھر کی کوئی بھی کلی، کوئی بھی گوشہ مجھ جیسی عورت کو رات گزارنے کے لیے کافی بھی ہے اور محفوظ بھی۔ میں جانتی ہوں کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا کوئی اچھا اور آسان کام نہیں۔ لیکن میں بہت مجبور ہوں۔ میرے ہاتھوں میں کوئی ہنر بھی نہیں ہے۔ اب لوگوں کی ہمدردی سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں کوئی ہمدردی کے بدلے سودا بازی پر اتر نہ آئے۔ اس لئے میں نے فیض کے ساتھ طے کیا کہ ہم یہ مشکل وقت اس گھر کے آنگن میں گزاریں گے۔ جب تک وہ چارہ کرے تب تک یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ حیا اس کے آگے کچھ بول نہ پائی۔ وہ بالکل مایوس نہ تھی۔ نہ مقدر سے شکایت تھی نہ تقدید لکھنے والے سے۔

دکھ بھری داستان سن کر فرشتہ کے دل پر کیا گزری ہے وہ جانتی تھی۔ کچھ کہنے یا دلاسہ دینے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔ اس نے اپنے پرس سے پانی کی بوتل نکالی۔ اور حیا کو پانی پلایا کچھ رقم ہاتھ پر رکھ کر گیٹ سے باہر نکلی۔ فرشتہ خود معصوم تھی، جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ جیسے تیسے گھر پہنچ گئی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ بستر پر دراز ہوئی، کروٹ بدلنے لگی، سوچنے لگی کہ یہ بات طے ہے میں کسی صورت میں حیا اور فیض کو نظر انداز تو نہیں کر سکتی ہوں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے لگی کہ کیا چار دن کی زندگانی کا مقصد صرف سیر و تفریح، فضول خرچی، لذیذ پکوان، بڑے بڑے موبائل فون، مہنگے مہنگے کپڑے، رنگ برنگے جوتے، زیورات کی نمائش، رنگ برنگی لمبی لمبی گاڑیاں بدلنا، خود ساختہ درداج کی پیروی کرنا یا چار سالہ عمر سے ہی بیٹی کے لئے جہیز جمع کرنا ہے یا زندگی کا اور بھی کوئی مقصد ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ہونے کے باوجود فرشتہ ایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔ اسے نہ دولت جمع کرنے کا لالچ تھا نہ اپنا نام کمانے کی

خواہش۔ وہ اپنے پیشے کے ساتھ انصاف کر کے مستحق لوگوں کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ سوچتے سوچتے رات گزر گئی۔ آخر فرشتہ نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی تو دل کے اندر سے آواز آئی: اُٹھ فرشتہ یہ سونے کا وقت نہیں۔ اٹھ جا کر حیا اور فیض کا ہاتھ تھام لے۔ انہیں یقین دلا کہ تو ہمیشہ ان کے ساتھ ہے۔ انہیں سماج کے لئے قابل فخر بنا۔ انہیں زندگی کی نئی اور روشن راہیں دکھا۔ یہ تمہارا اخلاقی فرض ہے۔ فرشتہ نے اپنی بھیگی آنکھیں کھولیں، آنسو اس کی آنکھوں میں ٹھہر چکے تھے۔ فجر کی نماز ادا کی، ہلکا پھلکا ناشتہ کیا، ہسپتال فون کر کے ایک ہفتے کے لیے چھٹی لے لی۔ نیک ارادے کے ساتھ اپنے ہی ہسپتال کے گروانڈ میں پہنچی۔ سامنے کھڑا فیض مسکرا رہا تھا۔ جیسے اسی کا انتظار کر رہا ہو۔ آج وہ بہت ہی مطمئن تھی۔ آگے بڑھ کر فیض کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر اپنے سینے سے لگایا۔

یقین

شبنم بنت رشید

خندہ جبیں، خوش پوش، لبوں پہ ہمیشہ سنجیدہ سی مسکراہٹ لئے، مہربان اور شفقت بھرے لہجے کی حامل، یتیموں اور مفلسوں کی خفیہ طور مدد کرنے والے، چھوٹے بڑے اور پیچیدہ مسائل سلجھانے میں ماہر، زیرک اور آسودہ حال شفقت حسین اپنے خاندان اور پورے گاؤں کے لئے ایک سایہ دار چنار کی مانند ہیں، اس کے سائے میں آکر اپنے پرائے سبھی راحت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔

صابر وشاکر جان صاحب کا شمار بھی گاؤں کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ انہیں رب العزت نے شرافت اور عزت کے علاوہ پانچ پانچ بیٹیوں سے نوازا ہے۔ ان کی بیٹیاں سگڑھ اور امور خانہ داری میں ماہر ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت اور حیا دار طبیعت نے جان صاحب کی شان میں چار چاند لگائے ہیں۔ وہ بیٹیوں کو بوجھ سمجھنے والے انسان نہیں ہیں بلکہ انہیں اپنی بیٹیاں گلے میں پھولوں کی مالا کی طرح لگتی ہیں۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اپنی نظروں سے دور نہ کریں۔ مگر دنیا کے دستور کے سامنے ہر انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ جان صاحب کی بڑی بیٹی زرق جہاں تعلیم سے فارغ ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب ڈھونڈ لی۔ اس کے لئے ڈھیر سارے رشتے آنے لگے۔ لیکن سرکاری نوکری نہ ہونے کی وجہ سے کوئی رشتہ طے نہ ہوسکا۔ شفقت حسین کے دوست نے بھی جاں صاحب کے سامنے کئی سال قبل امن کا ذکر کیا تھا، تب زرق جہاں زیر تعلیم تھی۔ امن کے والد، جو کہ شہر میں مقیم ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، شفقت حسین کے قریبی دوست تھے۔ رسر روزگار امن ظاہری طور پر اچھا لڑکا تھا

لیکن انسان کے باطن سے تو اللہ ہی واقف ہوتا ہے۔

جان صاحب کے دل میں شفقت حسین کی بے پناہ عزت تھی۔ ان پر کافی یقین اور بھروسہ تھا اور انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ شفقت کبھی کسی کا برا نہیں چاہتے بلکہ ان کے دل میں ہر ایک کے لیے ہمدردی اور خلوص ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ گھر میں زرق جہاں کے علاوہ چار اور بیٹیاں لائن میں کھڑی ہیں۔ ہر طرح سے مطمئن ہو کر زرق جہاں کا رشتہ امن کے ساتھ طے ہوا۔

ہلکے آسمانی رنگ کے خان ڈریس کے اوپر کالا کوٹ زیب تن کئے سر پر باریک کڑھائی والی میچنگ ٹوپی پہنے ہاتھ میں عصا لیے ہوئے شفقت حسین شادی سے ایک ہفتہ قبل ہی ان صاحب کے گھر پر بہ نفس نفیس موجود رہے۔ سارے کام ان کی نگرانی میں نظم وضبط کے ساتھ ہوتے رہے۔

شادی کی تقریب شروع ہوئی تو اپنے پرائے سبھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ کئی دن پہلے زرق جہاں کو مایوں بٹھایا گیا۔ پھر مہندی کی رسم بھی خیر سے ادا کی گئی۔ اس کے بعد ضیافتوں کا پروگرام، نکاح خوانی اور برات کے استقبال کی تیاریاں اور پھر رخصتی۔

شہر سے آئی ہوئی بیوٹیشن اور زرق جہان کی سہیلیاں بڑی نزاکت سے اسکو سجا رہی ہیں۔ عورتیں زرق برق اور مختلف رنگوں کی پوشاک زیب تن کیئے ہوئے شادی کے روایتی گیت گا گا کر تقریب کی رونق دوبالا کر رہی ہیں۔ اس تقریب میں شامل ہر انسان کو موڈ خوشگوار ہے اور موسم بڑا سہانا۔ گھر آنگن رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔ ضیافتوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو اور خوشیوں کا منظر، جیسے شادی نہیں خوشیوں اور خوشبوؤں کا کوئی میلہ ہو۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ اور ہنستے مسکراتے چہرے۔ برات آنے کا وقت قریب آتے ہی نکاح پڑھنے کے لیے قاضی صاحب بھی آ گئے۔ اسی دوران امن کے گھر والوں کی طرف سے فون آیا کہ امن آستین کا سانپ نکلا۔ اس نے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انکار کی وجہ بھی نہ

بتائی گئی۔ ایک ہی لمحے میں سارا منظر بدل دیا، جیسے خاموش قیامت بر پا ہوئی ہو۔ جان صاحب اوراس کی بیگم بی بی ثریا کے ہوش اُڑ گئے۔ یہ ایک ایسا خاموش دھما کا تھا کہ جس سے ہر انسان کا دل چھلنی ہوا اور آنکھیں نم ناک۔ زرق جہاں، اس کی سہیلیوں اور بہنوں کی رنگ پیلی پڑگئی۔ بات کرنے کی سکت نہ رہی۔ جیسے ان کے بدن سے جان نکالی گئی ہو۔ حالات ایسا رخ اختیار کرینگے، کبھی کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔

جانے کیا لکھا تھا زرق جہاں کے ہاتھوں کی لکیروں میں ورنہ آج تک شفقت حسین کی نگرانی میں بے شمار رشتے طے ہوکر، پایہ تکمیل کو پہنچے۔ ان کی زندگی میں ایسا موقع پہلی بار پیش آیا جب ان کا یقین دھوکہ کھا گیا، وہ بھی کسی اپنے س۔ جب انسان کا یقین دھوکہ کھاتا ہے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ شفقت حسین کی سانسیں بے ترتیب چلنے لگیں۔ ان کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ آب آب ہو گئے۔ جہاں کھڑے تھے وہی زمین پر بیٹھ گئے۔ آج زندگی میں پہلی بار آبرو پر حرف آیا تھا۔ کافی دیر سوچتے رہے، دل ہی دل میں کوئی فیصلہ لیا اور کھڑے ہو گئے۔ شرمندگی کا احساس اتنا شدید تھا کہ کسی سے نظریں ملانا بھی مشکل ہورہا تھا اور اپنے لفظوں کو بیان کرنا.....! پھر بھی نظریں نیچے کر کے اور اپنے خشک گلے کو تر کرتے ہوئے جان صاحب اور بی بی ثریا کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ میں شام ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ اللہ پر یقین رکھنا اس کی رحمت سے ناامید ہونا۔ زرق جہاں میری بیٹی ہے۔ میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ میں اس کو اس کی خوشیاں دلا کر رہوں گا۔ اس کے بعد شفقت حسین نے اپنے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔ وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے، جہاں ان کا اپنا بیٹا اظہار حسین شہر کی یونیورسٹی میں پڑھائی کر رہا تھا۔ دنیا میں اکثر دیکھا گیا کہ عظیم اور نیک لوگ اپنی عزت یا دوسرے کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی قیمتی سے قیمتی چیز داؤ پر لگانے سے نہیں ہچکچاتے۔ لیکن اولاد تو انمول دولت ہوتی ہے۔ یہ شفقت حسین کے مزاج کا ٹھہراؤ تھا، یقین تھا اپنی تربیت پر اور یقین تھا اپنے خون پر کہ اس

نے شہر پہنچنے سے پہلے اپنے بیٹے کو فون کیا۔ اسے بتایا کہ ضروی بات کرنی ہے۔ بات کرنے کے لئے یونیورسٹی سے باہر پارک میں بلایا۔ پارک میں دونوں باپ بیٹے ملے۔ شفقت حسین نے تمام صورتحال سے اپنے بیٹے کو آگاہ کیا۔ اظہار حسین نے اپنے ابا کی ہر بات سر جھکا کر سن لی۔ سر اُٹھا تو اقرار کے ساتھ۔ زبان سے بھی اقرار کرتے ہوئے کہا کہ ابا! آپ اپنے پرائے کے لیے کتنے رفیق و شفیق اور ہمدرد ہیں۔ آپ نے ہمیشہ اپنی کم اور دوسروں کی زیادہ پرواہ کی ہے۔ یہی انسانیت کا تقاضا ہے۔ یہ بہت بڑی ات ہے۔ یہ فیصلہ وقت کی ضرورت ہے اور حالات کے مطابق بھی ہے۔ ویسے میری نظر میں رشتہ ٹوٹنا کوئی عیب نہیں۔ چاہے شادی سے پہلے ٹوٹے یا شادی کے وقت۔ دکھ کی بات تو ضرور ہے لیکن رشتہ ٹوٹنے سے نہ عزت کم ہونی چاہئے اور نہ قیمت۔ ابا، مجھے اپنے آپ پر فخر ہے کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کرکے یہ فیصلہ کیا۔ ایسے فیصلے عظیم اور یقین والے لوگ ہی تو کرسکتے ہیں۔ اگر یہ فیصلہ صحیح سمت جائے گا تو ہر ایک کی آبرو بھی برقرار رہے گے اور کتنے دل ٹوٹنے سے بچ جائیں گے۔

میں اپ کی بات سمجھ ہی نہ پایا بیٹا، کیا میرا یہ فیصلہ صحیح سمت نہیں جائے گا؟ شفقت حسین نے اپنے بیٹے سے وضاحت چاہی۔

ابا! میرا مطلب ہے کہ آپ کے فیصلے سے جان صاحب اور زرق کا متفق ہونا ضروری ہے۔ کہیں زرق کے ساتھ ناانصافی نہ ہوجائے۔ معاملہ چار دن کا نہیں عمر بھر کا ہے۔ اگر زرق راضی ہے تو مجھے کوئی بھی اعتراض نہیں۔ اظہار حسین کی ہر بات واضح تھی۔

ہاں بیٹا! یہ پیچیدہ مسئلہ بن گیا۔ گھر پہنچ کر اس مسئلے کو حل کریں گے۔ اظہار حسین نے کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ جیسا باپ ویسا بیٹا۔ بالکل اپنے باپ کا پرتو۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں باپ بیٹا گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔

دنیا کی ریت رہی ہے کہ جب کسی کا رشتہ ٹوٹتا ہے تو لوگ کاتب تقدیر کو بھول کر اس ٹوہ میں لگ جاتے ہیں کہ رشتہ کب ٹوٹا؟ کیوں ٹوٹا؟ اور کس طرح ٹوٹا؟ ہر طرف تیر اور نشتر یوگ

اپنی اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو بھول کر اس کی عیب جوئی شروع کرتے ہیں جس کا رشتہ ٹوٹا ہو۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن اس کے برعکس دنیا میں اچھے اور توکل پرست لوگوں کی کمی نہیں۔ ان اچھے لوگوں کے پاس یقین کی دولت ہوتی ہے۔ اپنے یقین کی وجہ سے کسی دوسرے انسان کی دنیا بدل دیتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

حسب وعدہ ہلکی آہٹ کے ساتھ شام ہونے سے پہلے پہلے شفقت حسین اپنے بیٹے کے ساتھ ہر بات طے کر کے جان صاحب کی دہلیز پر پہنچ گئے۔ یہ ان کا دل جانتا تھا کہ وہ کس صورتحال سے گزر رہے ہیں۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ ہمت جٹا کر اس نے التجا یہ انداز اور ندامت بھرے لہجے میں اپنی رائے جان صاحب اور بی بی ثریا کو کے سامنے پیش کی۔

اظہار حسین آیا زرق جہاں کو اپنا بنانے کے لئے، اس کا شریک سفر بننے کے لئے، لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار جان صاحب اور زرق جہاں کو دے کر انہیں عزت بخش دی۔ انہیں ہمت دی اور حوصلہ دیا، خلوص کے ساتھ۔ جان صاحب کا بکھرا اعتماد بحال ہو گیا۔ چونکہ وہ شریف خاندانی انسان تھے اسی لئے انہوں نے شفقت حسین کی رائے کا احترام کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ اچھا ہے مناسب تدبیر ہے لیکن صورتحال پہلے جیسی نہ رہی۔ ہم اپنی بیٹی سے پوچھ کر ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی ایک لڑکی کتنی لجا اور شرم وحیا کے ساتھ کتنے مہینے ہفتے دن اور لمحے انتظار کرتی ہے اس حسین اور قیمتی گھڑی کے لئے۔ تصور میں کسی انسان کے ساتھ اپنی حسین دنیا بساتی ہے اور پھر اگر وہی انسان اس گھڑی بدل جائے تو اس لڑکی کے لئے اس سے بڑا صدمہ کیا ہو سکتا ہے۔ دلہن بنی بیٹھی زرق جہاں کے لیے یہ کس قدر دردناک اور اذیت انگیز تھا، یہ وہی جانتی تھی۔ یہ گھڑی اس کی زندگی بدل تو گئی لیکن اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے اس سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ گھر میں تمام عزیز واقارب موجود تھے۔ اس کے باوجود

پورے گھر میں خوفناک سناٹا اور خاموشی تھی۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ ایک ایک پل ایک ایک صدی کی طرح بیت رہا تھا۔

جان صاحب اور بی بی ثریا نے اپنے عزیزوں سے صلاح مشورہ کیا۔ اس کے بعد بی بی ثریا اپنی لاڈلی بیٹی زرق جہاں کے پاس آئی۔ زرق جہاں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ لاڈلی بیٹی کے دکھ کی وجہ سے ان کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ زبان بھی ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا، ہم بہت شرمندہ ہیں۔ ہماری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی، آپ کا دل ٹوٹ گیا۔

نہیں ماں، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے، نہ ہی کسی اور کا۔ یہ تو میرے مقدر کا لکھا تھا۔ یہ سارا مقدر کا کھیل ہوتا ہے۔ زرق جہاں نے جواب دیا۔ بیٹی کی باتیں سن کر ان کے اندر ہمت آئی تو انہوں نے شفقت حسین کے لائے ہوئے رشتے یعنی اظہار حسین کا ذکر کیا۔ اسے یقین دلایا کہ جو وہ چاہی گی وہی ہوگا۔ اپنے معصوم چہرے پر بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے زرق جہاں کہنے لگی۔ ماں، میرا دل چاہتا ہے کہ اب میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں۔ لیکن میں نہ تو خود غرض ہوں نہ ہی ضدی۔ میں اپنے والدین اور اپنی بہنوں کی خاطر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہوں۔ امن ہو یا اظہار حسین یا کوئی اور، میرے لیے کوئی خاص نہیں۔ میرے لئے صرف آپ کی عزت اور آپ کا فیصلہ اہم ہے۔ دراصل والدین کی رضامندی میں ہی بیٹی کی رضامندی ہوتی ہے۔ جو بھی آپ کا فیصلہ ہوگا مجھے دل سے منظور ہوگا۔ آپ جس سمت اور جس وقت اشارہ کریں گے میں اس سمت میں چل پڑوں گی۔ آپ مجھ کو ہر حال میں فرمانبردار بیٹی پائینگے۔

ماں، کبھی کبھی انسان بہت مجبور ہوتا ہے۔ امن کی تھی کوئی بڑی مجبوری رہی ہوگی اور کسی کو اپنی مجبوری نہ بتا سکا ہوگا۔ اسی لئے نوبت یہاں تک پہنچی سب کو دکھ پہنچا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ بس اس پر یقین اور کامل ایمان ہونا

چاہیے۔شفقت چاچا بھی قابل احترام ہیں۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔زرق جہاں نہ مایوس تھی نہ خفا۔اس کے لہجے میں ہلکا سا درد تھا۔ایک ہی پل میں سب کو بری کر دیا۔بیٹی کی مثبت سوچ سے واقف ہو کر جان صاحب کے ذہن کے دریچے کھل گئے ۔ان کے اندر ہمت آئی۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں اور سوچنے لگے کہ جن بچوں کو ہم معصوم سمجھتے ہیں کبھی کبھی وہ ہم کو بہت کچھ سیکھنے کو دیتے ہیں۔ہمیں جینا سکھا دیتے ہیں اور یہ بھی سوچنے لگے کہ عورت ذات کمزور نہیں ہوتی بلکہ مرد سے بھی زیادہ بہادر ہوتی ہے۔ ہر طرح کے حالات کے لیے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ ہر سوال کا جواب جانتی ہے۔اگر عورت ذات کا کوئی دوسرا نام ہوتا تو شاید صبر وتحمل ہوتا ہے یا ایثار ہوتا یا پھر یقین ۔اپنی بیٹی کی ایک ایک بات ان کے زخموں کا مرہم بن گئی۔رات آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی۔ایک تیز طوفان آیا تھا لیکن ایک مہکتے ہوئے جھونکے کی طرح گزر گیا۔فجر کے نور کے ساتھ ساتھ زرق جہاں اظہار حسین کے قدم سے قدم ملا کر بابل کی دہلیز کو پار کر گئی، جیسے شمس وقمر کی جوڑی۔ یقیناً ایسے جوڑے تو عرش پر ہی بنتے ہوں گے۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھلے جو ہمیشہ کھلتے رہے۔

تیرے لئے

تبسم ضیا

وہ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی، دھوپ کی شدت کی وجہ سے اُس کا رنگ بھی دھیما پڑ چکا تھا، لیکن پھر بھی کبھی سائیکل پر، کبھی ریسٹورنٹ میں، کبھی پیدل سڑکوں پر بنا اپنی پروا کئے میں اکثر اُسے دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں سوچتی، یہ جو اپنی صحت کے لیے اس قدر فکر مند رہتی تھی، ان دنوں اسے کیا ہوتا جا رہا ہے جب کہ جہاں تک محبت کا تعلق تھا وہ بھی اُسے مل چکی تھی۔ خدا جانے پھر وہ اس طرح سے کیوں بھٹک رہی تھی...........؟

بُرا بھی لگتا تھا اُس کا یوں رہنا لیکن میں کچھ بھی پوچھنے یا کہنے سے قاصر تھی کیونکہ کچھ روز قبل کسی بات پر ہم دونوں میں بات چیت بند تھی۔ پھر بھی دِل تڑپ رہا تھا یہ جاننے کے لیے کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے، وہ جو ہمیشہ مسکراتی رہتی تھی اُس کا چہرہ بجھ سا کیوں گیا ہے؟

خود کا بھی خیال نہیں کر رہی، کیا ہو گیا ہے میری دوست کو؟

چند روز قبل ہی تو میرے گھر میری شادی کی بات چھڑنے پر آئی تھی، خود بھی بہت خوش تھی، میرے گہرے رنگ کے لباس پر نکتہ چینی بھی کی تھی اُس نے............ بیشک میری خوشی میں وہ بھی خوش تھی۔

میری بات پکی ہوئے کافی روز بیت چکے تھے۔ وہ جو ہر دوسرے روز میرے یہاں آئے بغیر نہ رہتی تھی۔ بھلے ہی مجھ سے ناراض تھی۔ آج کل نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ نہ سڑکوں پر، نہ سائیکل پر، نہ کسی کے ساتھ یہاں تک کہ مجھے مبارک بھی دینے نہ آئی تو تشویش نے سر اُبھارا...........

میں نے اپنی ماں سے تذکرہ کیا تو اُنہوں نے اُس کے گھر جا کر دیکھ آنے کو کہا۔

ماں کے کہنے پر میں اپنی بھابی کے ساتھ اُس کی طرح راہ لی، گھر پہنچی تو سناٹا پایا۔

خدا جانے کیا ماجرا ہے؟

اُس کی ماں سے سامنا ہوا تو میں نے شکایت کر ڈالی کہ وہ مبارک دینے بھی نہیں آئی میرے یہاں، آخر آنٹی بات کیا ہے، کہاں ہے تبسم؟

پوچھتے ہی اُس کی والدہ رو پڑیں۔

میں حیران سی اُن کے چہرے کو دیکھتی چلی گئی............

آخر ہوا کیا ہے آنٹی، وہ خیریت سے تو ہے نا؟

میری بھابھی کے دریافت کرنے پر وہ سسکتے ہوئے بولیں............

وہ بہت بیمار ہے کچھ کھاپی بھی نہیں رہی، دن بہ دن اُس کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ تمہارے گھر جانے کے لیے کہا تو بگڑ گئی اور کہنے لگی ہر گز نہیں جاؤں گی، مبارک تو ایک طرف، یہ شادی ہر گز نہیں ہونے دوں گی۔ کیوں آنٹی، آخر ایسا کیا ہو گیا؟

مجھے دل برداشتہ دیکھ کر اُنہوں نے کہا، وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔

بس! وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے خدا جانے۔

پھر کیا ماجرا ہے؟

پتا نہیں، کہتی ہے تمہاری شادی وہاں نہ ہونے دے گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے کیوں کہ لڑکا سہی نہیں ہے۔

اب ایسا کیوں کہہ رہی ہے تم خود پوچھ لو............

لیکن وہ ہے کہاں آنٹی؟

اُوپر سے چار روز سے کھائے پیئے بنا اپنے کمرے میں بند پڑی روتی رہتی ہے۔ کیا کروں، کیسے سمجھاؤں اس لڑکی کو کہ جو وہ سوچ رہی ہے اتنا آسان نہیں ہے............

ہم دونوں اوپر کمرے کی اور چلدیں، دروازہ کھلا تھا وہ بستر پر لاغرسی لیٹی ہوئی تھی، بہت کمزور لگ رہی تھی۔

میرا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا، اتنی حسین لڑکی نے اپنے آپ کو کس مصیبت میں ڈال رکھا تھا............

میں سب کچھ بھول کر اُس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، وہ بھی رونے لگی۔

کیا ہو گیا ہے تجھے، کیوں کر رہی ہے، بتا سچ کیا ہے کیونکہ کسی خاص وجہ کے بنا تو، ایسا ہر گز نہیں کر سکتی؟

کوئی تو ایسی بات ہے جو تجھے پریشان کئے ہوئے ہے۔

بتا کیا ہوا ہے؟

وہ زار و قطار رونے لگی اور پھر اُس نے دل کے باندھ کھول دئے۔

تم وہاں شادی نہیں کرو گی۔

ہر گز نہیں کرو گی۔

تمہیں میری قسم، تم انکار کر دو گی............

ورنہ میں ایسے ہی اپنی جان دے دوں گی، دیکھ لینا............

ارے! ہوا کیا، کچھ بتاؤ گی بھی؟

میں اپنے ماموں کے یہاں گئی تھی۔ لڑکے والے اُن کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں۔ ماموں کی بیٹی نے بتایا کہ اُن کے دن رات کو بارہ بجے کے بعد شروع کرتے ہیں۔ پوری پوری رات ہلہ گلہ اور شراب کا ساتھ رہتا ہے۔ وہ شرابی اور بُرے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ لڑکا کسی دوسری لڑکی کے چکر میں بھی ہے............

ماموں کی بیٹی سے یہ سب سننے کے بعد، بتاؤ میں چپ چاپ کیسے بیٹھی رہتی! اُن کو

پوری طرح جاننے کے لیے میں دن رات پوچھ تاچھ کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگی۔ تمہارے بھائی کو بھی کہا لیکن وہ بیچارہ بھی بے بس تھا، کرتا بھی کیا؟

میں بھی تیرے والدین سے بات کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ غلط نہ سمجھ لیں کہ شاید میرا ہی کوئی لینا دینا تو نہیں ہے لڑکے سے............

میں اس چکر میں لڑکے والوں کے کچن تک جھانک آئی یہاں تک کہ آس پڑوس والوں نے بھی نفی کا اظہار کیا............

بس! میں تو جیسے ٹوٹ سی گئی کیونکہ کہاں تم جیسی شاعرہ اور کہاں وہ اَن پڑھ نا اہل لڑکا۔ جوڑی بالکل نہیں میل جول کھاتی تھی لیکن کیا کرتی، بھٹکتی رہی لیکن کچھ پلے نہیں پڑا تو بستر پکڑ لیا۔

میں نے تمہارے والد صاحب کے نام ایک خط بھی لکھا ہے، چار بچوں کا باپ بن کر کیوں کنواری اور جوان لڑکی کا سیدھے لفظوں میں کچھ کہنا شاید غلط سے لے لیا جاتا............

میں اُسے دیکھے جا رہی تھی .... ایسی قربانی .... میرے لئے.......... اور پھر فلم کی طرح اُس کا بھٹکنا میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

اچھا تو یہ باوجود ناراض ہونے کے میری وجہ سے اپنے آپ پر ستم توڑتی رہی اور میں نا جانے کیسے کیسے قیاس پالتی رہی............

اُس کے فہم، اُس کی محبت، اُس کی وفاداری سے میں کافی متاثر ہوئی............ میں نے اپنی شادی کی بات والدین پہ چھوڑ رکھی تھی، یہ رشتہ بھی اُنہوں نے ہی جوڑا تھا پھر مجھے اب سچائی جان کر رشتہ ٹوٹنے پر خاص فرق بھی نہیں پڑنے والا تھا۔

اپنی دوست پر مجھے خود سے بھی زیادہ بھروسہ تھا کیونکہ بہت بار اُس کی روک ٹوک نے مجھے سہی کیا تھا، اُس کی سمجھ بوجھ کا کم از کم میں مقابلہ نہیں کر پائی۔

میں بھلا چپ کیسے رہتی۔

اچھا تو یہ وجہ تھی تمہارے بھٹکنے کی، میرے گھر نہ آنے کی............پگلی کہنی کی، کیا یہ ممکن تھا کہ تم کچھ کہو اور کوئی یقین نہ کرے؟

کیوں اتنے دنوں تک چُپ رہی تم؟ بلاوجہ خود کو پریشان کیا............

میری بات سن کر وہ بستر چھوڑ میرے گلے لگ گئی، بے ساختہ میری آنکھیں برس پڑیں............

یہ رونا، رشتہ ٹوٹنے کا ہرگز نہ تھا بلکہ اپنی دوست میں میرے لیے اس قدر محبت اور جان نثاری کا جذبہ پا کر خوشی اور حیرت کا رونا تھا۔

اُس وقت فخر سے میرا وجود اندر ہی اندر ناچنے سا لگا۔

اے میرے مولیٰ! ایسی دوستی، نہ دیکھی نہ سنی............ گھر واپس آنے پر میری بھابی نے والد صاحب سے سب کچھ کہہ ڈالا............ خط بھی دکھایا............ والد صاحب حیرت زدہ رہ گئے اور فرمایا: بیشک اگر یہ سب ''تبسم'' نے کہا ہے تو سچ ہی ہوگا کیونکہ اُس بچی پر تو مجھے بہت زیادہ بھروسہ ہے............

لہٰذا! بھائی اور اُس کے دوستوں کو چھان بین کے لیے کہہ دیا گیا۔

سب کچھ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا............

وہ بدنیت لوگ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ طرح طرح سے معافی مانگ کر ابا جان کو منانے کی کوشش کرنے لگے لیکن اُن کی دھاڑ نے اُن کے چھکے چھڑا دئے۔

خیر خیر کر کے رشتہ ختم ہوگیا۔ لوگ منگنی ہونے پر دعوت کا اہتمام کرتے ہیں ہم نے بد ذاتوں سے چھٹکارا پانے پر دعوت دے ڈالی، سب بہت خوش تھے کہ میری جان چھٹی............

نہ جانے میرا آنے والی زندگی میں کیا حشر ہوتا اگر میری دوست میری مدد نہ کرتی، میں

... اَب تک زندہ بھی ہوتی یا نہیں!

آج میری دوست، میری ہر خوشی، ہر غم میں برابر شریک ہے۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں، کیا میں اس حد تک محبت کے قابل ہوں، کہ کوئی اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرے اور داؤ پر لگا دے؟

تو ایک پیاری سی آواز میری سماعت سے ٹکرا کر میرے وجود میں مٹھاس بھرتی چلی جاتی ہے............

میں ہوں نا............

کبھی بھی، کہیں بھی............

''تیرے لئے''

بس، تیرے لئے............

وعدہ

کتنی شدید تھی اُس کی محبت بھری تڑپ، کتنی خوش تھی وہ۔

کیسے کیسے ارمانوں سے کپڑے اور دیگر اشیاء کو سمیٹ سمیٹ کر، سجا سجا کر رکھ رہی تھی۔اُسے پورا یقین تھا کہ اب کے اُس کے شوہر کے کہے الفاظ پتھر کی لکیر ثابت ہوں گے۔ اُس کو سسرال واپس لے جانے میں اب وہ ایک دن بھی نہ آگے بڑھائیں گے۔

مائیکے آتے اُسے کافی عرصہ گذر چکا تھا اس اُمید پر دِن دِن گذر رہا تھا کہ آج نہیں تو کل اُسے عزت سے واپس اپنے گھر ضرور لے جایا جائے گا............

یہی اعتماد اُسے زندہ رکھے ہوئے تھا............

کیا کہا؟

''ہاں! میں تمہیں کل بھی نہ لینے آسکوں گا، خدارا مجھ پر بھروسہ رکھو، کوئی ضروری کام آن پڑا ہے آج۔

میں خوب سمجھتا ہوں تمہارے دُکھ کو، مجھے ان باتوں کا بھرپور اندازہ ہے، لیکن میں تمہیں پوری تیاری اور عزت کے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں'' ....

.... عزت............ عزت............؟

اُس کی خاموشی مسکراہٹ طنز اور بے بسی کی چغلی کھا رہی تھی۔ میری عزت تو اسی میں ہے کہ آپ مجھے اپنے کئے وعدے کے مطابق لے جاؤ تا کہ لوگوں کی چھبتی نگاہوں کے وار

سے بچ سکوں...........

سمجھا کرو بابا! میری چند مجبوریاں ہیں اور پھر ابھی تمہارے لیے کوئی سونے کا زیور بھی تو لینا ہے۔ خالی ہاتھ لینے آنا اچھا لگے گا کیا؟

کچھ تو سمجھا کرو، میں بس ایک دوروز میں ضرور آؤں گا...........

ایک عرصے سے اُسے یہی کہہ کر ٹالا جارہا تھا اور اب تو اُس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

سجنے سنورنے کے بعد پھر بیٹھ جانا، پھر لوگوں کے سوالوں کے جواب دینا، اُن کی طنزیہ باتوں کا شکار ہونا اُس کے نصیبوں میں لکھا جاچکا تھا۔ آج آ کر لے جانے کا وعدہ اُسے پکا لگ رہا تھا........... لیکن........... آج بھی وہی سب سہنے کی اُس میں طاقت نہ تھی۔

مجبوریاں........... زیور........... زیور........... مجبوریاں! کاش آپ سمجھ سکتے میری عزت آپ کے کیے وعدے میں ہے نا کہ بے جان سونے کے زیورات میں...........؟

یہ سوچ کر وہ سنبھل نہ سکی...........

اُس کے شوہر زیورات اور اپنے کیے وعدے کو پچھتاوے کے خیالی ترازو میں تولنے لگا۔

جس میں وعدے کا پلڑا بہت بھاری نکلا۔

بیوی کا ٹھنڈا وجود........... بے جان کھلی آنکھوں سے بھیک مانگ رہا تھا........... ''لحد'' تک عزت سے بہچا آنے کی بھیک...........

دانے دانے پہ ہے

میت کور

''ہے خدایا.......''

''اا آ آ....... س سلیمہ اااا....... کہاں گئے سب....... سہیل....... سجاد اااد.......''

رسوئی میں کھانا کھاتے کھاتے چاچا نے اچانک چلانا شروع کر دیا۔

''نوری پی نو وری بیٹا پانی دے دو مجھے پانی دے دو....''

سامنے ہی بیٹھی چچا کی سات سالہ پوتی جو اپنی پلاسٹک کی گڈیا کے ساتھ کھیلنے میں مشغول تھی اپنے دڈو کی اچانک سے غیر ہوتی حالت کو دیکھ پہلے ہی مستعد ہوگئی تھی۔ دوڑ کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

چاچا زور زور کر چلانے لگے۔

''کہاں مر گئے مردودے، سب کے سب.......'' چاچا کے چلانے میں کوئی کمی نہ آئی۔ اسی دوران، آواز سن کر، بغل کے کمرے سے چاچا کے دونوں بیٹے اور بہو رسوئی کی طرف دوڑ پڑے۔ ''کیا ہوا اا ابو کیا ہوا.......''

''ارے تم تو یہی چاہتے ہو کہ میں کل کی آئی آج مر جاؤں....... میری آواز کو سن کر بھی ان سنا کر رہے ہو۔ اور یہ بہو کھانا سامنے ڈال کر خود دفعان....... ارے کوئی دیکھو بھی،

دال سبزی کا تو پوچھو، پانی تو دے دو' چھوٹی بہو نے دیدے گھما کر چاچا کے سامنے رکھے پانی کے گلاس کی طرف دیکھا تو سہیل نے فوراً بڑھ کر گلاس اٹھالیا ''یہ لیں ابو' وہ گلاس چاچا کے لبوں تک لے آیا۔

''ہوا کیا ابو؟'' بیٹوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

میری سانس بند ہورہی ہے....... چاولوں کا ایک دانہ میرے حلق میں اٹک گیا ہے....... میں مر رہا ہوں....... مجھے بچالو....... ناہنجارو کچھ کرو....... '' لمحہ بے لمحہ بگڑتی حالت میں بھی چاچا کا لہجہ کڑوا کسیلا ہی تھا۔ بہو، بیٹوں کو صورتِ حال کا پتہ چلا تو سب چاچا کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ کوئی چاچا کی کمر تھپتھپانے لگا تو کوئی پانی پلانے لگا۔ چاچا گھر میں ابو، دڈّو تھے لیکن محلے کے چھوٹے بڑے سب کے لئے چاچا تھے۔ شام ہوتے ہوتے گھر میں بھیڑ لگ گئی، مشورے ہوئے، تدبیریں کی گئیں لیکن چاچا کے حلق سے دانہ نکلنا تھا نہ نکلا۔

رات تو جیسے تیسے نکل گئی صبح ہوتے ہی چاچا کو ہسپتال لے جایا گیا۔ صبح تک گلے میں ہلکی ہلکی سوزش بھی ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر نے چاچا کو چیک کیا، ان کی بپتا سنتیو کچھ ٹیسٹ کروانے کے لئے کہا اور اشارہ دیتے ہوئے کہ یہ چاول کا ایک دانہ نہیں بلکہ کوئی پرانا زخم ہے جو اچانک نمودار ہو گیا ہے، اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا کہ شائد اپریشن کروانا پڑے۔

''ارے ڈاکٹر صاب چاول کا دانا ہی تو پھسا ہے اس میں اپروشن کی کیا بات ہے؟'' چاچا اب بمشکل بول پارہے تھے لیکن اوپریشن کی بات سن کر ہکلانے کے انداز میں ہی بول پڑے۔

محلے والوں کے مشورے سے گھر والوں نے فیصلہ لے لیا اور دوسرے روز اپریشن کی تیاری کرنے لگے۔

پڑوسیوں رشتے داروں کو جب پتہ چلا تو ایک ایک کر کے چاچا کو دیکھنے ہسپتال پہنچنے

لگے۔ تیمارداری کی آڑ میں جتنے منہ اتنی باتیں نکلنے لگیں۔ کوئی ڈاکٹروں کی برائی کرتا کوئی نئے نئے قصے لے کر بیٹھ جاتا، کوئی اپریشن کے فیصلے کی تعریف کرتا کوئی نئے خطروں سے آگاہ کرنے لگا۔ ایک صاحب یہ مشورہ دے گئے کہ چاچا کو فوراً جموں لے جایا جائے جہاں، بہو رکھ علاقے میں ایک جوگی رہتا ہے جو، حلق میں پھنسے چاول کے دانہ کو جھاڑ پھونک اور منتر سے نکال لاتا ہے۔ چاچا بضد ہو گئے کہ وہ جموں جائیں گے اپریشن انہیں کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔ دونوں بیٹوں نے چاچا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بالآخران کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور دوسرے ہی روز اوپریشن کی خاطر جمع کئے گئے پیسوں سے کرائے کی ٹیکسی کی اور جموں کے لئے نکل پڑے۔ چاچا کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی وہ اوپریشن سے بچنے کے لئے جموں جانے کو راضی تو ہو گئے تھے لیکن لمبے سفر نے ان کی مشکلوں کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

راستے میں کئی جگہوں پر وہ کچھ پوچھنا چاہتے لیکن بولنا ان کے لئے مشکل ہوا جا رہا تھا۔ جواہر ٹنل میں گاڑی داخل ہوتے ہی چاچا ذرا سا گھبرا بھی گئے لیکن اندر ہی اندر بسورتے رہے۔

''یہ جواہر ٹنل ہے ابو........'' سجاد نے چاچا کی بے چینی بھانپتے ہوئے کہا تو چاچا نے ایسی حالت میں بھی اس کی طرف اس ترش نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تو کل کا بچہ مجھے بتائے گا؟''

رام بن کی سرنگ نما دھرتی سے گزرتے ہوئے وہ شدت سے جموں پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ قریب ایک بجے وہ رام بن پار کر کے پیہڑا میں کھانے کے لئے رکے۔

''ابو کچھ کھا لو........ تھوڑا سا........'' سہیل نے چاچا کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

چاچا کو بھوک تو خوب لگی تھی لیکن اب حالت یہ تھی کہ کھانا تو دور کی بات، پانی بھی گلے سے اتارنا محال ہو چکا تھا۔ انہوں نے سہیل کی طرف دیکھا اور کچھ ہکلاتے ہوئے اور کچھ اشارے سے سمجھایا کہ وہ سب وقت ضایع کئے بنا کھانا کھالیں اور جلدی آگے بڑھیں تا کہ

وقت پہ جموں پہنچ سکیں اور ممکن ہو تو رات کو ہی واپس سرینگر کے لئے نکل بھی آئیں۔

سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے تو چاچا ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کر باہر سائے تلے جا بیٹھے اور بے صبری سے ڈرائیور اور بیٹوں کے کھانے سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

قومی شاہراہ سے بمشکل پچاس فیٹ ہٹ کر ریستوران کے احاطے سے چاچا شاہراہ پر آتی جاتی تیز رفتار گاڑیوں کو تکنے لگے۔ چاچا نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور پھر سے، ایک ہاتھ کی ہتھیلی سے ناک کو تقریباً چھپائے ہوئے، دھواں اڑاتی گاڑیوں کو گھورنے لگے۔

''کم بخت ایسے چلتے ہیں جیسے گاڑی نہ ہو ہوائی جہاز اڑا رہے ہوں'' چاچا من ہی من میں ڈرائیوروں کو کوسنے لگے۔

اتنے میں ایک گاڑی ذرا سڑک سے ہٹ کر کیا گزر گئی کہ دھول اور دھوئیں سے چاچا بے حال ہونے لگے۔ اچانک چاچا نے اتنی زور سے چھینکا کہ ایک دانا حلق سے نکل کر ان سے پرے زمین پر گر پڑا۔ دانہ گرنے کی ہی بات تھی کہ دور بیٹھا ایک کوا اپنی جگہ سے اڑا اور چاچا کے پاس سے ہوتا ہوا دانہ چونچ میں اٹھا کر فُر ہو گیا۔ چاچا نے اس تیز رفتاری سے واقع ہوتے ہوئے حالات کو سمجھنے اور اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے کھنکھار کر کھانسا اور نحیف مگر فاتحانہ آواز میں قریب قریب چیختے ہوئے بیٹے کو پکارا۔

''میں ٹھیک ہو گیا ٹھیک ہو گیا....... سہیل ل ل'' چاچا خاموشی سے اچھل پڑے۔

پھر کوئے کی طرف دیکھ کر جو ابھی تک آسمان میں اُڑ رہا تھا بولے ''ارے اوئے مردودوے!....... اگر اوپر والے نے میرے ہاتھوں سے دانا تیری قسمت میں لکھا تھا تو پہلے ہی بتا دیتے نا میں پوری بوری لے آتا....... ضروری تھا مجھے اتنا پریشان کرنا؟!

بوجھل قدم

میت کور

''کون تھا؟''

''پوسٹ مین''۔

''کیالایا......؟''

''ڈاک......''اس نے ذوقی کو دکھاتے ہوئے چھیڑنے کے انداز میں مسکرا کر کہا۔

ذوقی چڑ گئی ''میں مذاق کے موڈ میں نہیں''

''میں بھی ہرگز نہیں'' ماجد نے جھٹ سے بناوٹی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''ڈاک تو ہے...... لیکن ڈاک میں آخر آیا کیا ہے'' ذوقی نے مزید زور دے کر استفسار کیا۔ ''ڈاک میں...... ہاں ہاں ڈاک میں خط ہے'' ماجد نے پھر آنکھ مارتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا اور خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''پرویز احمد'' ماجد نے واقعی سنجیدہ ہو کر آنکھیں بند کر کے اپنی یاداشت پر زور دیتے ہوئے خط پر لکھا نام بلند آواز سے پڑھا ''میں تو اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا......''

''پرویز'' کا نام لفافہ کی پشت پر دیکھ کر ذوقی کا چہرہ فق ہو گیا جو ابھی تک محض بناوٹی غصہ دکھا کر مزے لے رہی تھی۔ ہنستے کھیلتے آباد چہرے پر رونی رنگت چھا گئی۔

''ارے بھئی، کھولو بھی...... پتہ تو چلے کون صاحب، کیوں یاد فرماتے ہیں''

ماجد نے اپنی کرسی دیوار سے پرے دھوپ میں کھینچتے ہوئے کہا۔ ذوقی کے لب سِل

گئے تھے۔ بدحواسی میں ہاتھ سے لفافہ گر گیا جو ماجد نے یہ سمجھتے ہوئے اٹھا لیا کہ شاید اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ذوقی کے ہاتھ سے پھسل گیا ہے۔ بھیجنے والے نے خط کی ابتداء اپنے تعارف سے کی تھی ''مسٹر ماجد، آپ مجھے نہیں جانتے لیکن آپ کی پتنی اچھی طرح مجھے جانتی اور پہچانتی ہیں اور انہی کی وجہ سے میں آپ کو جانتا ہوں''۔ خط میں پرویز نے جوتی کے ساتھ اپنے معاشقے کی داستان پوری تفصیل کے ساتھ رقم کر کے بھیجی تھی۔ کس طرح ذوقی سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی، کیسے ان میں دوستی بڑھی جو بڑھتے پیار بن گئی اور کیسے ذوقی اس راہ پر کافی آگے تک جانے کے باوجود آسانی سے پلٹ کر واپس لوٹ گئی۔ پرویز نے خط میں سب کچھ تفصیل سے لکھا تھا۔ ایک طرف جہاں اس کی زیادہ تر باتیں سچائی پر مبنی تھیں وہیں کہیں کہیں بڑھا چڑھا کر رومانوی قصے بھی بیان کئے تھے جو ایک غیرت مند خاوند کو بیوی کے قتل پر ابھارنے کے لئے کافی تھے۔ ثبوت کے طور پر دو چار تصویریں بھی ساتھ تھیں جو بہت گری ہوئی نہ سہی لیکن کسی بھی شوہر کے لئے ناقابلِ برداشت ضرور تھیں۔ خط اس اقتباس پر ختم ہوتا تھا۔ ''اس خط سے میرا مقصد صرف اور صرف آپ کو اندھیروں سے نکال کر حقیقت دکھانا ہے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ آپ کے ساتھ شادی ہو جانے سے پہلے اس عورت کے میرے ساتھ تعلقات کس حد تک تھے، یہ میں واضح کر چکا ہوں۔ آپ کے یقین کے لئے تصویریں بھی بھیج رہا ہوں۔ آپ کا ہمدرد پرویز'' اس نے گمنام رہنے کے بجائے اپنا صحیح نام اور پتہ بھی دیا تھا اپنے ٹیلیفون نمبر سمیت۔

پورے کا پورا خط ذوقی نے بھی پڑھ لیا تھا۔ ماجد کے عین پیچھے کھڑے کھڑے۔ وہ چاہتی تھی کہ خط پڑھتے ہوئے ماجد کا ری ایکشن دیکھے لیکن وہ اس کی ہمت نہیں جتا پائی۔ وہ ماجد کے ہاتھ میں موجود اوراق پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں سے اشک ایسے بہہ رہے تھے جیسے اچانک کوئی جھرنا پھوٹ پڑا ہو۔ خود اسے اپنے آنسو بہنے کا احساس تب ہوا جب اس نے اپنے کانپتے ہونٹوں میں نمکینی محسوس کی۔ اس کے ہونٹ مسلسل کانپ رہے

تھے۔ وہ نیچے کے ہونٹ کو اوپر کے دانتوں تلے دبا کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ بولنا چاہ رہی تھی لیکن ہمت جواب دے چکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو عجیب بے بسی کے عالم میں پا رہی تھی۔

ماجد نے خط پڑھنے کے بعد اُسی ترتیب سے اس کو تہہ کرتے ہوئے جس طرح وہ کھولے جانے سے پہلے تھا، واپس لفافے میں ڈال دیا اور اس میں ماجود تصویروں کو دیکھے بنا ہی لفافے کو پُرزے پُرزے کر کے پاس پڑے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ دوسرے ہی لمحے ماجد نے آہستگی سے اُٹھ کر ذوقی کی طرف دیکھا اور اس کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ذوقی کو لگا جیسے کھسکتی ہوئی زمیں واپس اس کے پاؤں کے نیچے آ کر تھم گئی ہو اور آسمان کی بکھرتی ہوئی قاشیں دوبارہ سالم ہو کر آسمان میں فِٹ ہوتے ہوئے اس پر سائبان بنا رہی ہو۔ ''اوہ ماجد، تم میرے مسیحا ہو۔ میرا جی چاہتا ہے تمہارے قدموں میں اپنی جان نچھاور کر دوں۔ تم کتنے اچھے ہو۔ کوئی اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے مجھے یقین نہیں ہو رہا۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی لیکن زبان بالکل خاموش تھی۔

''ماجد اس گھٹیا انسان کے ساتھ میرے تعلقات ضرور تھے لیکن ایسا کچھ نہیں تھا جس طرح کا اوپریشن اس نے اس letter میں دینا چاہا ہے...... '''' ذوقی نے جو بولنے کے لئے زبان کھول دی تو اب بولتی ہی چلی جا رہی تھی...... ''میری اور اس کی دوستی صرف اور صرف دوستی ہی رہی...... اور پھر ہماری engagement کے بعد تو میرے دل میں کبھی بھولے سے بھی اس کا خیال نہیں آیا ہوگا...... '' وہ ماجد کے سامنے مزید صفائی دے کر خود اپنی تسلی کر لینا چاہتی تھی......

''ذوقی، تم کیا سمجھی میں اس گھٹیا انسان کی کمینی حرکت سے متاثر ہو جاؤں گا...... ہو جاتا شاید...... لیکن ذوقی تمہیں پا کر میں بہت خوش ہوں...... میں تم سے پیار کرتا ہوں اور تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔'' وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ''ذوقی یقیناً مجھے ٹھیس پہنچی ہے لیکن اس کی وجہ وہی کمینہ پرویز ہے نہ کہ تم''

ماجد معصومانہ انداز میں بول رہا تھا'' ...... تم نے تو مجھے بے پناہ محبت دی ہے...... تمہاری اس والہانہ محبت نے ہی تو مجھے زندگی کے حقیقی معنوں سے روشناس کرایا ہے...... میں کبھی بھی...... پل بھر کے لئے بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ تم کسی اور سے بھی محبت کر سکتی ہو'' ایک بار پھر اس نے پورے زور سے ذوقی کو گلے لگایا جیسے ایک جسم ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس سانحہ سے دونوں کی ازدواجی زندگی میں ذرہ برابر بھی کڑواہٹ نہیں آئی بلکہ دونوں کے دلوں میں محبت کا نیا سمندر اُمڈ پڑا تھا۔ پرویز کی توقعات کے بالکل برخلاف دونوں گویا کچھ ہی دنوں میں اس واقعہ کو یکسر بھول گئے اور اگر کہیں ذکر چھڑا بھی تو محض ہنسی مذاق کے سامان کے طور پر۔ پرویز اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ البتہ ذوقی کے دل میں ماجد کی قدر و منزلت انتہائی بڑھ گئی تھی۔ وہ اس کی نظر میں فرشتوں سے بڑھ گیا تھا جس پر وہ دل ہی دل میں نثار ہوتی رہتی اور اپنی قسمت پر رشک کرتی۔

''ذوقی'' ماجد نے دفتر جاتے جاتے ذرا عجلت میں پکارا'' جی فرماااااایئے ے ے ے ے ے''۔ ذوقی نے دفتر کے لئے نکل رہے شوہر کو خوش خوش گھر سے بھیجنے کے انداز میں ناز وادا سے آنکھ ماری۔ ''بیڈروم والی الماری میں سب سے نچلے والے ڈرار میں ایک پرانی سی فائل پڑی ہوگی۔ وہ لیتے آنا'' ماجد سمجھانے کے انداز میں ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہا تھا۔ ذوقی جو ماجد کی آواز پر اسی کی طرف آ رہی تھی فوراً پلٹ کر فائل لانے چلی گئی۔ ''اہوہ ہ ہ ہ'' اس نے ہلکا سا زور لگاتے ہوئے فائل باہر کھینچی'' یہ تو لگ بھگ بوسیدہ ہو چکی ہے۔'' فائل کے ساتھ ہی کچھ پرانے کاغذات بھی باہر آ گئے۔'' یہ تو ماجد کی تصویر ہے مگر...... '' ذوقی نے نیچے گری دو تصویریں اُٹھاتے ہوئے کہا۔ تصویریں دو نہیں ایک ہی تھی جس کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ اس نے دونوں حصوں کو جوڑ کر دیکھنا چاہا۔ تصویر میں ماجد کے ساتھ کوئی نسوانی چہرہ تھا جس کے رخساروں پر ماجد کے لب ٹکے تھے۔ وہ ذہن پر زور دے کر اسے پہچاننے کی بے سود کوشش کرنے لگی۔ اس چہرے پر شدید ناگواری صاف دکھائی پڑ رہی تھی۔'' ذوقی...... کتنی

دیر کودی...... میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" باہر سے ماجد کی آواز گونجی تو ذوقی نے خود کو نارمل کرتے ہوئے فائل اُٹھائی اور بیڈروم سے باہر آ گئی۔ "جی آ رہی ہوں۔"

۞۞۞
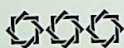
شہادت کی انگلی

رافیہ رسول مغموم

اس کے ماں باپ نے جانے کیا سوچ کر اس کا نام سکندر رکھا تھا۔شاید انہوں نے اپنے اجداد سے سکندر کے کارناموں کا تذکرہ سنا ہوگا اور اپنے آنکھوں میں سکندر بننے کا خواب سجا کر اپنے بیٹے کا نام سکندر رکھا ہوگا۔سکندر کی تعلیم بھی اس بستی کے عام بچوں کی طرح ہوئی جو میلوں ننگے پاؤں پیدل چل کر سکول جایا کرتا تھا اور سکول سے واپس آکر اپنے مال مویشیوں کو چرانے کے لئے دور کھلے میدانوں میں لے جایا کرتے تھے اور وہیں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ بستی کے بچوں سے سکندر مزاج میں تھوڑا الگ تھا اور گھر کا ماحول بھی مختلف تھا۔ ہر وقت وہ اپنے آپ میں بے چینی محسوس کرتا تھا، میدان میں بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے کھیلتے اچانک کسی سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر اس کے ساتھی آہستہ آہستہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگے۔سونے سے پہلے ماں اسے قصے کہانیاں سنایا کرتی تھی، یہ روز کا معمول تھا اور کہانی سنتے سنتے وہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا۔ باپ سے شہر کے بارے میں سوالات پوچھتا تھا، اس کے ذہن میں یہ بات سما چکی تھی کہ اس گاؤں کے باہر بھی دنیا ہے جہاں وہ سارے کردار موجود ہیں جو وہ اپنی ماں سے سنی گئی کہانیوں میں موجود تھے۔

اگرچہ گاؤں میں ہر ایک کے پاس اپنی زمین اور مویشی تھے جن سے وہ اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے اور سکندر کا باپ بھی اس کو زمینداری میں لگانا چاہتا تھا لیکن ماں اس کو آگے پڑھانا چاہتی تھی۔ اکثر دونوں میں اس بات پر چھوٹے چھوٹے جھگڑے بھی ہوتے تھے کہ

سکندر کو گاؤں میں رہ کر زمینداری کرنی ہے یا آگے پڑھنا ہے۔ بالآخر بیوی کی ضد کے سامنے شوہر کو ہار ماننا پڑی اور سکندر کو شہر میں تعلیم دلانے کے لئے رضامند ہو گیا۔ اگر چہ سکندر ابھی آٹھویں جماعت میں ہی پڑھتا تھا تاہم جب سے اس کے کانوں میں یہ بھنک پڑی کہ ماں اسے آگے پڑھانا چاہتی ہے اس کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ وہ دن بھی آ گیا جب اس نے آٹھویں جماعت پاس کیا۔ مزید پڑھنے کے لئے اسے قصبے میں موجود ہائی اسکول میں داخلہ لینا تھا جو گاؤں سے تقریباً سات کلومیٹر دور تھا۔ اس کے باپ نے فیصلہ کیا کہ اگر شہر کے کسی اسکول میں اس کا داخلہ ہو جاتا ہے تو وہ بہتر رہتا۔ یہی سوچ کر وہ شہر چلا گیا جہاں اس کا ایک قریبی رشتہ دار ایک ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھ صلاح مشورہ کر کے اس نے سکندر کے لئے ایک ایسے اسکول کا انتخاب کیا جو اس کے رشتہ دار کے گھر کے قریب ہی واقع تھا۔ سارے ضوابط پورا کر کے وہ گھر لوٹ آیا اور اپنی بیوی کو خوشخبری سنائی۔ سکندر بھی تذبذب میں تھا۔ جب اس نے سنا کہ اس کا داخلہ شہر کے سکول میں ہونے جا رہا ہے تو وہ بہت زیادہ خوش ہونے لگا۔ دوسری طرف سکندر کی ماں یہ خبر سن کر خواب بُننے لگی۔

وہ وقت بھی آیا جب سکندر شہر روانہ ہوا۔ پہلی بار گھر سے، اپنے والدین اور دوستوں سے دور زندگی کے دوسرے پڑاؤ میں قدم رکھا۔ شہر کی گہما گہمی دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس کی سوچ سے دنیا بہت بڑی ہے۔ گاڑیوں کی ریل پیل، سڑکوں پر لوگوں کا اژدھام، اسے اپنا وجود ایک زرہ لگنے لگا۔ کیا میں اس شہر میں اپنی جگہ بنا پاؤں گا؟ یہ سوچ کر تھوڑی دیر کے لئے اسے مایوسی ہوئی لیکن ماں کی دیو مالائی کہانیاں اس کے ذہن میں کیڑوں کی طرح کلبلانے لگیں اور وہ نئے عزم اور مضبوط قدم کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ رات کو سونے کی بہت کوشش کی لیکن ان گنت خیالات نے اسے سونے نہ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شروعات کیسے کروں۔ کون سی، کیسی، کس طرح کی شروعات، اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کب نیند اس پر غالب آ گئی۔

سورج پڑھتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی اور آنکھیں مل کر بستر ے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور تیار ہو کر سکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ سکول کی نئی وردی پہنی، بوٹ پہنا اور سکول کی طرف رروانہ ہوا۔ چونکہ یہ پہلا دن تھا اس لئے اس کا باپ سکول کے گیٹ تک سکندر کو چھوڑنے کے لئے آیا تھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سکول کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے اپنے باپ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور ایک عزم کے ساتھ سکول کے گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

دن گزرتے گئے مگر اس کی بے چینی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کے من میں بار بار یہی خیال ستاتا رہتا تھا کہ اس کو تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ کرنا ہے، کیا کرنا ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

ایک دن خالی پیریڈ میں وہ سکول کے پلے گراؤنڈ میں یونہی سوچوں میں گم ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے کرکٹ بال آکر گری۔ وہ چونک پڑا اور اپنے اردگرد دیکھا تو پایا کہ وہاں چند لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ جھک کر اس نے بال اٹھائی اور اسے اپنے ہاتھ سے دبانے لگا۔ یہ وہ بال نہیں تھی جس بال سے وہ اپنے گاؤں میں کرکٹ کھیلا کرتا تھا، وہاں تو وہ ردی کاغذ کو پرانے کپڑوں کے ٹکڑوں میں لپیٹ کر بال بناتے تھے، مگر یہ بال الگ قسم کی تی۔ اچانک اس کے جسم میں سرسراہٹ دوڑنے لگی اور اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کی منزل اس کی مٹھی میں آ گئی۔ اس نے بال کو پوری قوت کے ساتھ اوپر اچھالی اور من ہی من میں کہنے لگا 'چل اپنی منزل کو پالے'۔

چونکہ تعلیم میں وہ دوسرے لڑکوں سے قدرے بہتر تھا، دھیرے دھیرے وہ اپنی قابلیت سے اساتذہ کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ اب وہ اس فکر میں تھا کہ کس طرح سے وہ کرکٹ کے کھیل میں اپنا کمال دکھا سکے۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے انچارج سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا لیکن انچارج نے اس کی بات کو ان سنی کر کے اسے اہمیت نہیں

دی۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا اور بالآخر اس کو کھیلنے کا موقع ملا۔ پہلے روز جب اس نے بال ہاتھ میں لی اور باؤلنگ کرنے لگا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گاؤں کا وہ سارا سماں گھومنے لگا جب وہ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتا تھا، اس نے من میں یہ بات بٹھادی کہ سامنے کھیلنے والے سبھی وہی میرے گاؤں کے ساتھی ہیں جن کے ساتھ کرکٹ کھلا کرتا تھا۔ اسنے آنکھ بند کر کے بال پھینکی، تماشائیوں کا شور اس کے کانوں میں گونجا، آنکھیں کھولیں تو بلے باز آوٹ ہو چکا تھا اور وکٹ دور نیچے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا، پہلی گیند پر وکٹ حاصل کرنا، وہ بھی اس کھلاڑی کا جو سکول میں منجھا ہوا مانا جاتا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، جس کسی سکول کے ٹیم کے ساتھ مقابلہ ہوتا تھا وہ اپنی شاندار کارکردگی دکھاتا تھا اور بہت جلد مشہور ہوا۔ دوسری طرف تعلیم کے میدان کا بھی شہسوار نکلا۔ کالج میں داخلہ لیا اور دو سال وہاں بھی خوب کرکٹ کھیلی، آخر وہ دن آہی گیا جب اسے مقامی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔

کہاوت ہے کہ ہیرے کی پہچان جوہری ہی کر سکتا ہے۔ یہی کہاوت سکندر پر پوری اتری۔ بین الریاستی میچوں میں سکندر کو شامل کر لیا گیا۔ وہاں بھی اس نے اپنے جوہر دکھائے۔ چونکہ بین الاقوامی میچوں کا آغاز ہونے والا تھا اور قومی ٹیم میں نئے کھلاڑیوں کو شامل ہونے کا یہ سنہری موقعہ تھا۔ جب سکندر کی کارکردگی کو جانچا گیا تو وہ قومی ٹیم کے لئے کھرا اترا۔ اسے ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے شہرت ملنے لگی۔ پہلے بین الاقوامی میچ میں اسے کھیلنے کا موقعہ ملا۔ وہ دن اس کی زندگی کا یادگار دن تھا، اپنے والدین کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے وہ میدان میں اتر گیا۔ جب اس کے ہاتھ میں گیند تھما دی گئی تو اسے یقین ہو گیا کہ سکندر کو اب کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ جب پہلا وکٹ اس کی جھولی میں گرا تو وہ اور بھی شیر بن گیا اور کسی بھیڑئے کی طرح ایک ایک کر کے حریف ٹیم کے چار کھلاڑیوں کو ڈھیر کر دیا۔ اگر چہ ٹیم میں تین نئے کھلاڑیوں کو شامل کر لیا گیا تھا تاہم سکندر

اپنی شاندار کارکردگی کی وجہ سے اخبارات اور ٹیلی ویژن کی زینت بن گیا، تجزیہ کاروں نے اسے قومی ٹیم کے مستقبل کا کپتان قرار دیا۔

دوسرے میچ میں اسے کوئی وجہ بتائے بغیر کھیلنے سے دور رکھا گیا۔ اسے مایوسی بہت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ سلیکٹرس کے ساتھ معاملہ اٹھانا چاہئے مگر نیا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے وہ رک گیا اور تیسرے میچ کا انتظار کرنے لگا۔ تیسرے میچ کے دوران اسے کھلاڑیوں کو پانی پہنچانے کے کام پر لگایا گیا، وہ سوچنے لگا کہ آخر وجہ کیا ہے کہ اسے کھیلنے سے روک دیا جاتا ہے۔ کھیل کے اختتام پر جب وہ ہوٹل پہنچا تو کچھ کھائے بغیر ہی بستر پر ڈھیر ہوا اور آنکھیں بند کرلیں۔ سارے مناظر اس کے سامنے اانے لگے، اپنا کچا گھر، گاؤں کی وہ چھوٹی چھوٹی گلیاں جن پر ننگے پاؤں چل کر وہ میدان میں جا کر ٹوٹی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے کو بلا بنا کر کھیلا کرتا تھا، تھک ہار کر واپس گھر لوٹنا اور دیر سے گھر پہنچنے پر ماں کا پیار بھرا غصہ، سب کچھ آنکھوں کے سامنے فلم کی مانند دکھنے لگا۔ کب صبح ہوئی معلوم ہی نہیں پڑا۔ چونکہ آخری میچ اگلے دن تھا اسی لئے بڑے آرام سے وہ تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کر اس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا اور ایک اور عزم لے کر کمرے سے باہر نکلا۔

ہوٹل کے ایک کمرے ٹیم کے میں سینئر کھلاڑیوں اور سلیکٹرس کی میٹنگ چل رہی تھی، باقی جو جونیئر کھلاڑی تھے وہ ہال میں موجود تھے، سکندر آخران کے ساتھ بیٹھ گیا، ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن وہ گم سم چپ بیٹھا تھا۔ اچانک وہ کھڑا ہوا اور اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا جہاں میٹنگ چل رہی تھی۔ اندر ایک گول میز کے اردگرد کھلاڑی اور منیجمنٹ کے باقی لوگ بیٹھتے تھے اور بحث چل رہی تھی۔ جب سکندر نے دروازہ کھولا تو وہ سب چونک پڑے اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ٹیم کا منیجر ایک دم کھڑا ہوا گیا اور کہنے لگا How dare you۔ سکندر نے صرف اتنا کہا۔ ' مجھے کیوں نہیں کھلایا جارہا ہے؟'

یہ سنتے ہی سب کے سب اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ٹیم کا کپتان غصے

سے لال پیلا ہوا اور سکندر کے سامنے آ کر اس کی طرف اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کر کے کہا' کیونکہ تم ہم میں سے نہیں ہو، اس لئے' get out'

سمجھوتہ

رافعہ ولی

تمہیں اس کے چہرے میں ایسا کیا نظر آتا ہے جو تم اس کی طرف کھینچی چلی جاتی ہو۔ تم کیسے ان کیچڑ سے لت پت گلیوں سے گزرتی ہو۔ کیسے اس صحن میں بیٹھی ہو جہاں مویشیوں کا فضلہ جگہ جگہ بکھرا پڑا رہتا ہے۔ تم کیسے اس عورت کے پاس بیٹھتی ہو جس کے کپڑوں سے ایسی بساند آتی ہے جیسے مہینوں نسے نہائی نہ ہو۔ ''بول چکیں آپ''۔ میں نے اپنی ساس کی بات کو بیچ میں ہی کاٹا۔ کیونکہ اب وہ اس خاندان کی مین میخ نکال دیتی۔ وہ میرا اس طرح کسی ایسے گھر میں جانا بالکل بھی پسند نہیں کرتی جو سماجی اعتبار سے ہم سے بہت بچھڑا ہوا تھا۔ مگر میں نے جب سے سمیرا کی بیٹی کی ناگہانی موت کے بارے میں سُنا تھا میرا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا۔ میں اس سے مل کر اس کا درد بانٹنا چاہتی تھی۔ شاید ہر عورت کا درد مشترک ہوتا ہے، چاہے وہ سماج کے کسی بھی طبقے سے ہو۔ ''اماں آخر وہ بھی تو ہماری طرح انسان ہے۔'' میں نے اپنی ساس کو باور کرانا چاہا۔ میری ساس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''بچھو ہے وہ' ان کا انسانیت سے کیا لینا دینا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا ''آپ کا تو بڑا لینا دینا ہے۔ پچھلے سات سال سے میری زندگی اجیران بنا کر رکھ دی ہے۔ بات بات پر یہی تقاضا کہ بہو ایک بیٹا تو ہونا ہی چاہئے'' اور سات برسوں میں، میں نے ہر ڈیڑھ سال بعد ایک لڑکی کو جنا تھا۔ میں یہ سب دل میں سوچ رہی تھی، بولنے کی ہمت میں نے بہت پہلے کھو دی تھی۔ میری صبح عموماً بوجھل ہی ہوتی تھی۔ صبح کی اذان جیسے ہی میرے کانوں میں گونجتی مجھے محسوس ہوتا' رات کا خاتمہ ہو گیا۔ ہر صبح

پروہی گھرُ وہی لوگ۔ میں بجھے ہوئے قدموں سے کچن میں آئی' ناشتہ کیا اور اپنی چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ میرے قدم خود بخود اُس محلے کی طرف بڑھنے لگے جس کو میری ساس ڈوموں کا محلّہ کہتی تھیں۔ میں جس خاندان میں بیاہی گئی تھی وہاں کا کوئی بھی فرد اس محلے کے پاس بھی نہ پھٹکتا تھا۔ میں جب سے اس محلے میں آنے جانے لگی تھی مجھے شدت سے احساس ہو گیا تھا کہ انسان بڑا متکبر ہے اور جھوٹی تواضع دکھاتا ہے۔ انسانوں کا بس چلے تو ہر محلے کا الگ الگ خدا بھی رکھ لیں۔ میں سوچتے سوچتے اس دروازے تک پہنچ گئی تھی جو مجھے مطلوب تھا۔ میں نے اپنے اوپر سرسری نظر دوڑائی، میرے پاؤں کیچڑ سے لت پت ہو چکے تھے۔ اچانک میری سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگی کیونکہ میرا ہاتھ کسی نے زور سے پکڑ کر جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ امیر زادی؟ یہاں تو مزہ لینے آتی ہے یا خود کی بڑائی جتانے کے لئے۔ میری بیوی کے دماغ میں کیا خناس بھرنا چاہتی ہے۔ میں نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا " آپ کی تعریف؟" اس گھر کا مالک..... اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ میں بس آج اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ پھر آپ جو چاہیں اس کے ساتھ کریں۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔ مادا وہ مجھے دروازے سے ہی نہ لوٹا دے۔ "ٹھیک ہے" وہ کسی قدر ڈھیلا پڑ گیا۔ مگر دوبارہ ادھر نظر نہ آنا۔ میں جھپاک سے اندر گھس گئی، وہ ملگجا لباس پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کے کمرے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کا رنگ اور بھی سیاہ ہو چکا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر اس کی آنکھیں کسی سفید نقطے کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دھیرے سے اس کو آواز دی سمیرا....... سمیرا۔ آپ یہاں کیوں آتی ہو باجی، آپ کو مجھ سے گھن نہیں آتی۔ میں قریب بیٹھ گئی اور اس کے گھٹنوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ مجھے صرف یہ جاننا ہے تم نے ایسا کیوں کیا۔ آج میں آخری بار یہاں آئی ہوں۔ تمہارا شوہر مجھے دوبارہ یہاں آنے نہیں دے گا۔ ایک بار اس اندھیرے سے باہر نکل آؤ۔ آج کی عورت اتنی دبی کچلی نہیں۔ باہر ہزاروں لوگ تمہاری مدد کریں گے۔ تم بے سہارا نہیں ہو۔ ایسے آدمی سے ہر روز مار کھاتی ہو۔

اس ذلت کی زندگی کو چھوڑ کر آزاد فضا میں سانس لو۔ میں نے اس کو حوصلہ دینا چاہا جبکہ میں
جانتی تھی ایسا کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ سمیرا نے میرا ہاتھ کس کے پکڑ لیا اور زور سے ہنسنے لگی۔
مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا۔ باجی، میری بیٹی تو آج کی نہیں بلکہ کل کی عورت تھی، پھر
بھی میں نے اسکو ماردیا۔ میرے کانوں میں سانپ کی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ کیا؟ میں تو
سوچ رہی تھی تمہارے شوہر نے یہ سب کیا ہوگا۔ نہیں....... نہیں باجی، وہ تو بیٹی پا کر خوش
تھا۔ میرا ہاتھ دھیرے دھیرے سمیرا کے گھٹنے سے سرکنے لگا۔ وہ کمرے کی چھت پر نظریں
گاڑتے ہوئے بولی۔ باجی میری ماں کلکتہ کی تھی، کالی کلوٹی میری طرح اور میرے اپ نے
میری ماں کو کلکتہ سے یہاں لایا۔ پچاس ہزار میں خرید کر۔ میری ماں کوشش کر رہی ہے کہ
یہاں کی زبان بولے، یہاں کا رہن سہن اختیار کرے مگر وہ مکمل نہ ہوسکی۔ اس کی شخصیت ایک
مذاق بن گئی۔ وہ اپنی زبان اور اپنی شناخت تو بھول گئی مگر لوگ نہیں بھولے۔ میری پیدائش
نے بھی اس کے دکھوں کو کم نہ کیا۔ میں اسکول جانے لگی تو لوگ بہارن کہہ کر چڑاتے۔ میں ان
سب آوازوں سے پیچھا چھڑاتے یہاں اس گھر میں آئی کیونکہ یہ لوگ بھی میری طرح سماج
میں طعنہ سہتے تھے۔ میں اکثر سوچتی میرے یہاں لڑکا ہوا تو کسی نہ کسی کو میری طرح ضرور کالا
کردے گا مگر قسمت نے یہاں بھی جوا دیا اور میرے یہاں لڑکی ہوگئی۔ میں نے بیچ میں ٹوکتے
ہوئے کہا ”اتنی سی بات کے لئے کوئی کسی کی زندگی چھین لیتا ہے، وہ بھی اپنی اولاد کی۔“ باجی
کیا کہہ رہی ہو۔ اس نے بھی تو مجھے مار ڈالا۔ وہ پیدا ہوئی تو سارے محلے والے بولے ایک
اور بہارن آگئی۔ لوگ تو ویسے بھی اس کو مار ہی دیتے۔ میرا دیور اس کو گود میں لیتے ہوئے
بولا۔ سمیرا تم تو میرے ہاتھوں میں مچھلی کی طرح پھسلتی ہو، ایسا میری یہ بھتیجی نہیں کرے گی۔
آخر میں اس کا چاچا ہوں۔ میری لڑکی بڑی ہو رہی تھی اور میں ہر دن مر رہی تھی۔ اس کا چاچا
اس کے گال پر نشان چھوڑ جاتا اور کہتا بہت نمکین ہے۔ اُس دن بھی وہ چلا رہی تھی ”مما خون
نکل آیا، خون نکل آیا“۔ میں بھاگتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تو خون اُس کے چاچا کے منہ پر لگا

تھا مگر چلا وہ رہی تھی۔ اس کا چاچا کہنے لگا ''سمجھا اسے، پھسلنے لگ گئی تمہاری طرح۔'' تم نے کبھی اپنے شوہر سے نہیں کہا۔ میں نے پھر سمیرا کو ٹوک کر کہا ''ہمارے یہاں سب چھوٹے بچوں سے پیار کرتے ہیں''۔ سمیرا نے کہا میں تھک ہار کر بڑے پیر صاحب کے پاس گئی۔ انہوں نے کہا لڑکی کے منہ پر لحاف اوڑھ دو۔ میں نے یہی کہا۔ اب کیا غلط اور کیا صحیح۔ جب تک میرے یہاں لڑکا نہ ہوگا، میں ایسا ہی کروں گی۔ مجھے اب سمیرا سے سچ مچ خوف آنے لگا۔ میں اس لئے بیتاب تھی اور اس کی بیٹی کی خوشی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس سے ملنے پہنچ گئی۔ ان کا دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر وہ پہلی والی پژمردگی بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ''سمیرا، مبارک ہو لڑکا ہوا۔ جی آپ کو بھی مبارک ہو باجی۔ میں نے کہا تھا ناوقت نہ بھی بدلے تو میں بدل دوں گی۔ ہر بار میں گالی کیوں بنوں۔ مجھے سمیرا کے چہرے پر اطمینان مگر آنکھوں میں ویرانی سی محسوس ہوئی۔ باجی پر آپ سے کیا چھپانا۔ یہ سب دیور جی کی مہربانی ہے۔ میں نے تعجب سے سمیرا کو دیکھا اور اس نے نظروں کو زمین میں گاڑتے ہوئے کہا۔ باجی میں نے دیور جی کے ہاتھ سے پھسلنا چھوڑ دیا اور قسمت نے مجھ سے۔ آخر دیور بھابھی میں بھی تو پیار بہت ہوتا ہے۔

Jammu and Kashmir Ki Khawateen Afsana Nigaar

Suhail Saalim

سہیل سالم شہر خاص کے گنجان آبادی والے علاقے رعناواری میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کے نوجوان حصول علم
علاوہ کرکٹ اور فیشن پرستی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ شام ہوتے ہی یہاں کے نوجوان ٹولیوں میں گپ شپ اور موبائل پر انگلیاں
تے ہوئے برابر متحرک دیکھے جاسکتے ہیں۔ سہیل سالم نہ فیشن پرستی کے غلام ہیں، نہ ان کو کسی دوسرے شغل میں دلچسپی ہیں۔ ان کی
ں فقط کتابوں تک ہی محدود ہیں۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ ضرور ہوتا ہے اور جب
گفتگو کرتے ہیں تو ادب کے حوالے سے ہی بات کرتے ہیں۔ ان کی تحریرات مختلف مقامی اور بین الاقوامی اخبارات میں نظر آتی ہیں۔
ں سالم افسانے بھی لکھتے ہیں، تنقید بھی، کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں اور شاعری پر تنقید بھی لکھتے ہیں۔ ان کی تحریرات مختلف مقامی و قومی
ں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں جن میں ''آج کل''، ''شاعر''، ''تریاق''، ''لفظ لفظ''، ''شیرازہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ نوجوان قلمکاروں میں
ں سالم کی آواز منفرد اور گرجدار ہے۔ بقول شاعر

بجلیوں کی طرح میں کڑکا ہوں
بادلوں کی طرح میں برسا ہوں

ان کی نئی کتاب ''جموں وکشمیر کی خواتین افسانہ نگار'' منظر عام پر آنے کے لئے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اشرف عادل
سری نگر
۲۳ جولائی ۲۰۱۹